مطالعات اور مکاتیب

علامہ اقبال

مرتبہ

سید اختر الاسلام

"ناشر"

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۱۲۹۱ گلی کوتانہ سوئیوالان دہلی ۱۱۰۰۰۲

باراوّل ـــــــــ جون ۱۹۷۷ء

تعداد ـــــــــ ۲۵۰

زیرِ نگرانی ـــــــــ اعتقاد حسین صدیقی

طباعت ـــــــــ کوہِ نور پریس دہلی

قیمت ـــــــــ بیس روپے ۲۰/

سول ایجنٹ

ستیار وجاہت علی بک سیلر۔ جامع مسجد۔ گورکھپور

پیش لفظ

مطالعات اور مکاتیب علامہ اقبال

علامہ اقبال محض ایک شاعر ہی نہیں تھے۔ بلکہ حالات کی نیاضی نے انہیں ایک عظیم مفکر اور مدبر بھی بنا دیا تھا۔ وطن (ہندوستان) تقسیم ہوا تو انہیں بھی بانٹ لیا گیا۔ اربابِ کم فہم نے نظریاتی خانوں میں رکھ کر انہیں پاکستان کا بانی قرار دے دیا۔ حالانکہ ان کی حیات و ممات غیر منقسم ہندوستان میں ہوئی۔ اور ان کے افکار و نظریات سے عالمی انسانیت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے جس سے وہ کسی خاص وطن، خاص قوم اور خاص نظریے کے شاعر نہ ہو کر عالمِ انسانیت کے عظیم ترین شاعر و مفکر کی شکل میں اپنی اہمیت منوا گئے۔ ان کی شاعری اور فکر صرف الفاظ کی بازی گری نہیں بلکہ ان میں حالات کی سچی عکاسی کی ناقابلِ تردید صورتیں نظر آتی ہیں جن کا مطالعہ کرتے ہوئے ان سارے حالات اور ان کے پسِ منظر سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے، جو علامہ اقبال کی ژرف نگاہی سے نہیں بچ سکے۔ انہوں نے ان حالات کی عکاسی کرتے وقت شعری اوصاف اور فن کارانہ صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ اسی لئے ان کا کلام ادب کی عام سطحوں سے بلند ہو کر احساس، فکر، شعور اور فہم کی چیز بن گیا جس پر اظہارِ خیال کرنے کے لئے ان سارے جذبوں کی بالیدگی ضروری قرار پائی۔

ان دنوں اقبال صدی کا انعقاد بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ اب اقبال سے متعلق عصبی نظریے کی دیرینہ ختم ہو گئی ہے۔ اب انہیں صرف پاکستانی شاعر و مفکر نہیں بلکہ آفاقی

شاعر تسلیم کرلیا گیا ہے جس کی شاعری کی بنیاد مشرقی تہذیب و تمدن پر مبنی رہی۔ اسی مبارک موقعہ پر یہ حقیر سی کوشش بھی پیش کی جا رہی ہے۔ گُل دستے میں شامل جن اہلِ قلم (خواتین و حضرات) نے علامہ اقبال کے حسیاتی شعور پر قلم اٹھایا اور موصوف کے نظریاتِ ملّی اور افکارِ شعری سے بحث کی ہے وہ سارے جذبوں سے گزرے بغیر نہیں رہ سکے ہیں۔ مقامِ فخر ہے کہ اردو میں فن اور فکر سے آشنائی پیدا کرنے کی سطحیں یقینی طور پر بلند ہوئی ہیں جس کا ثبوت اس گل دستے میں شامل مضامین، منظومات اور مکاتیب ہیں جو موجودہ صدی میں علامہ مرحوم کو ایک بہترین ہدیۂ تبریک ہیں۔

کتاب کی ترتیب، خیال، حسن اور مشوروں کے سلسلے میں برادرم عزیز آنندری اور حسن کا رضیا فیضی نے جس طرح اپنا بے لوث تعاون پیش کیا اس کے لیے شکر گذار ہوں یہ علامہ اقبال کا پیغام انسانیت اور اسلامی طرزِ فکر کا ہی نتیجہ ہے جس سے یہ حضرات کافی حد تک بذاتِ خود متاثر ہیں۔ بہار الہ آبادی صاحب بھی قابلِ ستائش ہیں کہ انہوں نے نہایت دیدہ ریزی سے اس کی تصحیح کے فرائض انجام دیئے۔

سید اختر الاسلام
ایم۔ اے انگریزی و اردو (ریسرچ سکالر میرٹھ یونیورسٹی میرٹھ)
جون ۱۹۷۷ء

(فہرست مضامین آخر میں ملاحظہ فرمائیں)

غلام مرتضےٰ پراچہ

مردِ حق آگاہ

آج ہم اُس مردِ حق آگاہ کا یومِ پیدائش منا رہے ہیں جو حکیمانہ نظر رکھتا تھا اور حکیمانہ بصیرت، جس میں رُومی کا سوز و گداز تھا اور رازی کا پیچ و تاب، جو نہ اصفہانی تھا، نہ ایرانی اور نہ سمرقندی، جس کی نظر آفاق گیر تھی اور بُتانِ رنگ و خون کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جانے کی دعوت دیتی تھی تاکہ تمام مُسلمان حرم کی پاسبانی کے لئے نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر ایک ہو جائیں۔

اقبالؔ، اُس کا کلام اور اُس کی شخصیت ہر لحاظ سے ہمہ گیر ہے۔ اُس کے فکر کی اساس مغربی مادّیت نہیں بلکہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ وہ اس دُنیا کو مومن کی میراث سمجھتا ہے اور ہر لحظہ اپنے فکر و نظر کے تازیانوں سے اس کی خوابیدہ تعمیری حس کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل بن جائے۔

اُس کا پیغام دُنیا کے کسی گوشے یا علاقے یا فرد تک محدود نہیں۔ وہ تمام بنی نوعِ انسان کو مردِ مومن کا حیات افروز تصور پیش کر کے یہ پیغام دیتا ہے کہ انسان اور انسانیت کی فلاح صرف اس امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ خدا کی نیابت کا حقیقی وارث بننے کے لئے اُن زندہ و پائندہ اقدار کو اپنا لے جن سے اس کی خودداری بیدار ہو۔

یہ درویش صاحبِ نظر اس دیارِ خودی میں پیدا ہوا جس کا نام سیالکوٹ ہے۔ یہی وہ خاک ہے جہاں سے اس کا خمیر اُٹھا اور حضرت مولوی میر حسن کی زیرِ سرپرستی منزل بہ منزل اُس نقطۂ معراج تک پہنچ گیا جہاں انسان خود شناسی کی سرحدیں عبور کر کے 'یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ' کی قلمرو میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ ستارہ شکار ہمتِ مردانہ جو یزداں کو کمند میں لانے کے لئے پر تولتی ہے اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ آدمی ضبطِ نفس اور اطاعتِ حق کے مختلف مدارج طے نہ کرے اور اُن تمام دُنیاوی آلائشوں سے پاک نہ ہو جو اس کی فطرت میں کور ذوقی، زبوں ہمتی اور پست خیالی کا زہر گھولتی ہیں۔ میری ناقص رائے میں عصرِ جدید کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ فکرِ اقبال کی اس طرح ترجمانی کی جائے کہ اقبال کے تصورِ حیات کا ایک ایک گوشہ، ایک ایک زاویہ اور ایک ایک نقطہ اس طرح روشن ہو جائے کہ عوام اس کو سمجھنے، سمجھانے اور اُس پر عمل کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ کریں۔

آج خوش نصیبی سے یہاں وہ تمام ممتاز صاحبانِ فن شرکت فرما رہے ہیں

جن کا قلم تحقیق کے میدان کا شہسوار ہے اور ہمہ وقتی تجسس جن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ دراصل یہ وہ قلندرانِ اقبال ہیں جنہوں نے اقبال کو سمجھا ہے۔ اور اس کے کلام کی اتنی خوبصورت اور جاندار تشریحات کی ہیں کہ آج کا طالبِ علم اقبال کو اُس کے فکر کے عمق اور تصورات کی گہرائی کے باوجود ایک عوامی شاعر سمجھنے لگا ہے اور زندگی کے ہر موڑ، تاریخ کی ہر کروٹ اور زمانے کی ہر گردش میں صرف اس کے کلام سے فیضیاب ہونے کا متمنی ہے۔ میں ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام حسین، ڈاکٹر سید محمد اکرم اور ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی کا مشکور ہوں کہ وہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود یہاں تشریف لے آئے ہیں۔ ماسوائے ڈاکٹر عرفانی صاحب کے باقی حضرات نے جو یہاں پر آنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہی ان حضرات کا علامہ اقبال مرحوم سے محبت اور عقیدت کا بیّن ثبوت ہے۔ اِن جیسی ہستیوں کی نگارشات کا فیض جاری رہا تو اقبال کا کلام جغرافیے کی تمام مصنوعی حدبندیوں کو توڑتا ہوا بنی نوعِ انسان کے لئے یکساں اہمیت اور افادیت حاصل کرے گا۔ اور پھر شاعرِ مشرق صرف شاعرِ مشرق ہی نہیں بلکہ شاعرِ مشرق و مغرب ہوگا۔

اقبال کا پیغام صرف مردوں کے لئے نہیں بلکہ عورتوں کے واسطے بھی وہی جاذبیت رکھتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اس مشن میں کسی کو صنفِ نازک کی بھی نمائندگی کرنی چاہیئے۔ اس ضمن میں میں نے محترمہ مس رحمٰن ڈپٹی ڈائریکٹر مس ایجوکیشن

سے درخواست کی۔ اور ان کا ممنون ہوں کہ وہ تشریف لے آئی ہیں۔

صدرِ محترم میں آپ کا بھی مشکور ہوں کہ آپ نے صدارت قبول فرمائی اور مجھے خوشی ہے کہ آپ جیسا نیک سیرت انسان اُس عظیم انسان کو خراجِ عقیدت کے واسطے جو تقریب منعقد کی گئی ہے اس کی صدارت کر رہا ہے۔ میں آپ سب خواتین و حضرات کا بھی مشکور ہوں کہ آپ نے یہاں تشریف لا کر اس محفل کی رونق کو دوبالا کیا ہے۔

(خطبۂ افتتاحیہ)

میاں اصغر علی

شاعرِ مشرق

شاعرِ مشرق حکیم الامت علامہ اقبال کی تیسویں برسی پورے پاکستان میں منائی جارہی ہے۔ پاکستان کے تمام شہروں اور قصبوں میں ثقافتی، علمی و ادبی مجلسوں اور تنظیموں نے علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے خاص اجتماعات کا اہتمام کیا ہے۔ اِن اجتماعات میں علامہ اقبال کی زندگی اور ان کے افکار و نظریات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

اس عظیم مفکّر کی یاد منانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم اقبال کے نظریات کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرنے کا از سرِ نو عزم کریں۔

اقبال تعلیمی وحدت کے علمبردار تھے اور اسے اسلام کی رُوحانی

قدروں کے تحت ترقی دینے کے لئے سعیٔ مسلسل کے جذبہ سے سرشار تھے۔ ان کا قوتِ عمل اور نظریۂ حرکت و ترقی آج بھی اتنا ہی تر و تازہ ہے جتنا اس وقت تھا جب وہ اہلِ مشرق کو صدیوں کے خوابِ گراں سے بیدار کر رہے تھے۔ اور انہیں سائنسی ترقی کے نئے دور کا پُر اعتماد طریقہ سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر رہے تھے۔ اقبال یہ چاہتے تھے کہ سائنسی ترقی انسان کی عقلی اور روحانی ترقی سے ہم آہنگ ہونی چاہیئے تاکہ ایک معاشرہ پیدا ہو جو اسلام کے تقاضوں پر پورا اترے اور نظریاتی طور پر متوازن ہو۔

اقبال ملّتِ اسلامیہ کے لئے ایک خاص کشش رکھتے ہیں۔ اِن کے پیغام نے برّصغیر کے مسلمانوں کو ان کے قومی وجود کا شدید احساس دلایا۔ اور آج جب ہم اس عظیم مفکر کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں ہم میں سے ہر ایک کو یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ جو نظریات انہوں نے پیش کئے ہیں۔ ہم ان کے حصول کے لئے اپنے آپ کو از سرِ نو وقف کر دیں اور اسلام کی رُوحانی قوتِ عمل کے ساتھ اسے فروغ دینے کے لئے مسلسل کوشش کرنے کا جذبہ پیدا کریں۔

اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ علامہ اقبال کے زیادہ تر پیغام کا محرک و سرچشمہ اسلام ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں کہ ان کا پیغام صرف مسلمانوں

کے لئے ہے۔ اِن کا پیغام پُوری نوعِ انسانی کے لئے ہے۔ البتہ مسلمانوں کی ابھرتی ہوئی نسل کے لئے وہ بطور خاص اہم ہے۔ میرے خیال میں جو لوگ علّامہ مرحوم کو صرف اسلامی شاعر قرار دیتے ہیں۔ وہ اُن کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔ ایسا کہنے کا مقصد ان کے دائرۂ اثر کو محدود کرنا ہے۔

(خطبۂ صدر)

ڈاکٹر بشیر احمد خاں

قرارداد

ہم اہالیانِ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ حضرت علامہ مرحوم کا وہ تاریخی مکان جس میں انہوں نے آنکھ کھولی اپنی تحویل میں لے کر ازسرِنو مرمت کروائے۔ تاکہ اقبال کا یہ آستانہ جو اہلِ فکر و نظر کے لئے ایک زیارت گاہ کا درجہ رکھتا ہے زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہ سکے۔ اور آنے والی نسلیں اس دیارِ خودی سے فیضان حاصل کر سکیں۔

(ڈاکٹر محمد باقر)

تقدیرِ اُمم

قوموں کے عروج وزوال کی داستان بالعموم مورخوں کے زیرِ بحث رہی ہے۔ رزمیہ شاعروں نے بھی اس میدان میں جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے ہیں اور اخلاقیین نے بھی دنیا کی نامور شخصیتوں کو سراہنے یا مطعون کرنے کے لئے عروج وزوال کے سباب ووسائل کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ لیکن ان تمام باکمال فن کاروں کا مشترک نظریہ، یہ رہا ہے کہ مادی حالات کے بہتر یا بدتر ہونے کی وجہ سے کسی قوم نے بالترتیب عروج یا زوال حاصل کیا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ اُفق کی تاریخ پر ایسی شخصیتیں نمودار ہوئیں جن کے عروج کی داستان نے اقوامِ عالم کو محدود عرصہ کے لئے محوِ حیرت بنا دیا۔ لیکن بہت ہی جلد جب زوال نے ان کا تعاقب کیا تو دُنیا کا ایک کثیر طبقہ ان پر لعن طعن کرنے لگا۔

ماضی قریب میں نپولین، ہٹلر اور مسولینی کا نام اس فہرست سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ جن کے ساتھ یہ سلوک ہوا ان لوگوں کے مدحیہ قصیدے اس وقت تک تو پڑھے جاتے رہے، جب تک یہ برسرِ اقتدار تھے اور ملک پر ملک فتح کر رہے تھے۔ لیکن جب انھیں ناکامی یا موت نے آلیا تو یہی لوگ مردود گردانے گئے۔ اور انہیں ہدفِ ملامت بنایا گیا۔ کیونکہ ناقدین نے معیار یہی رکھا ہوا تھا کہ مادی حالات کس حد تک کون سی شخصیت کا ساتھ دے رہے ہیں۔ مسلمانوں کی اپنی تاریخ بھی آج تک کچھ اس انداز میں لکھی جاتی رہی ہے کہ عروج و زوال کو جانچنے اور پرکھنے کا معیار مادی کامیابی ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن دُنیائے اسلام میں اقبالؔ پہلا مفکّر ہے جس نے مورخوں، شاعروں اور اخلاقئین کے مسلمہ اصول اور نظریات کے خلاف اُمتوں کے عروج و زوال کو بالعموم اور ملّتِ اسلامیہ کی تقدیر کی ساخت و ریخت کو بالخصوص خدا اندیشی اور حق پرستی سے متعلق کیا ہے۔ اس کے نزدیک مادی وسائل اور دنیاوی جاہ و حشمت کی بھی کچھ اہمیت ہے۔ اور مادی وسائل میں وہ علم و فن کو ایک خاص درجہ دیتا ہے۔ ؎

قوّتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نی ز رقصِ دُخترانِ بی حجاب
نی ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست

نی ز عریان ساق و نی از قطع موست

محکمی او را نہ از لادینی است

نی فروغش از خطِ لاطینی است

قوّتِ افرنگ از علم و فن است

از ہمیں آتش چراغش روشن است

(جاوید نامہ)

فطرت کے نوامیس پہ غالب ہے ہنرمند

شام اس کی ہے مانندِ سحر صاحبِ پرتو

وہ صاحبِ فن چاہے تو فن کی برکت سے

ٹپکے بدنِ مہر سے شبنم کی طرح ضو!

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد

ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

(ضربِ کلیم، ۱۶۹ - ۱۷۰)

لیکن 'علم و فن' یا دیگر مادی وسائل کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اقبالؔ نے قومی عروج اور ملی استحکام کے سلسلے میں اس علم کو کوئی اہمیت نہیں دی جو انسان کو خدا اندیشی اور حق پرستی سے دور لے جائے۔ ؎

زندگی کچھ اور شئے ہے علم ہے کچھ اور شئے!

زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ!
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذّت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

(ضربِ کلیم، ۷۸)

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جَو

(ضربِ کلیم، ۱۶۹)

وہ صاف لفظوں میں انسان کے لئے لائحہ عمل بیان کرتا ہے۔

در قبائے خسروی درویش زی!
دیدۂ بیدار و خدا اندیش زی!
قربِ حق از ہر عمل مقصود دار
تا ز تو گردد جلالش آشکار

(اسرارِ خودی، ۷۰)

اور اس لائحہ عمل کو قوت سے فعل میں لانے کے لئے آئین یوں تجویز کرتا ہے۔

تو ہمی دانی کرہ آئینِ تو چیست؟
زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اولایزال است و قدیم

نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بی ثبات از قوتش گیرد ثبات

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمتہ اللعالمیں

ارج می گیرد ازو نا ارجمند
بندہ را از سجدہ سازد سربلند

(اسرار و رموز، ۱۴۰-۱۴۱)

ارجمندی حاصل کرنے کا لائحہ عمل بیان کرنے اور اس لائحہ عمل کی پیروی کرنے کا آئین تجویز کرنے کے بعد اقبال نے نہایت دانشگاف انداز میں متعدد مقامات پر یہ بیان کیا ہے کہ مسلمان نے قصرِ ملت کے استحکام کو اس آئین سے منحرف ہو کر کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ اقبال کے ہاں مسلمان کے زوال کا یہ قصہ 'جوابِ شکوہ' سے شروع ہوتا ہے اور اس کی آخری

تصنیف 'ارمغانِ حجاز' تک جاری رہتا ہے ؏

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار!!

مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کِس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟
ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟

قلب میں سوز نہیں رُوح میں احساس نہیں!
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں!

(بانگِ درا، ۲۲۵)

مومن و پیش کسان بستن نطاق!

مومن و غداری و فقر و نفاق

لا الٰہ اندر نمازش بود و نیست
نازہا اندر نیازش بود و نیست

تو در صوم و صلوٰتِ او نماند
جلوہ ای در کائناتِ او نماند

آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ
فتنۂ او حبسِ مال و ترسِ مرگ

رفت از و آن مستی و ذوق و سرور
دینِ او اندر کتاب و او بگور!

(جاوید نامہ، ۲۳۴-۲۳۵)

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش

تمدن، تصوّف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذّتِ شوق سے بے نصیب

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

(بالِ جبریل، ۱۶۰-۱۶۸)

اسی قرآن میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا!
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

(ضربِ کلیم، ۸)

شبی پیشِ خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا زارند و خوارند

بریا آمد نمیدانی کہ ایں قوم!
دلی دارند و محبوبی ندارند!

(ارمغانِ حجاز، ۵۴)

امت کے روایات میں گم ہو جانے اور خوب کو خوب بنا لینے کے بعد سیاسی فضا میں جعفر و صادق کثرت سے پیدا ہونے لگتے ہیں اور تقدیرِ امت ایک ایسی کروٹ لیتی ہے جو بظاہر تو نہایت خوشنما نظر آتی ہے لیکن دراصل یہ زوال کا آغاز ہوتا ہے۔ اور قوم کے فرد کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ کہ

گاہ او را با کلیسا ساز باز
گاہ پیشِ دیریاں اندر نیاز

دینِ او آئینِ او سوداگری است
عنتری اندر لباسِ حیدری است

تا جہانِ رنگ و بو گردد دگر
رسم و آئینِ او گردد دگر

ظاہرِ او از غمِ دیں دردمند
باطنش چوں دیریاں زنار بند

(جاوید نامہ، ۱۷۰)

افراد کی یہ کیفیت دیکھ کر اقبال فتویٰ دیتا ہے۔ کہ

جعفر اندر ہر بدن ملت کش است!
ایں مسلمانی کہن ملت کش است!
خند خنداں است و با کس یار نیست
مار اگر خنداں شود جز مار نیست
ملتی را ہر کجا غارت گری است
اصل او از صادقی یا جعفری است

(جاوید نامہ، ۱۷۰)

افرادِ ملت کی یہ منافقانہ روش تقدیرِ امت کو اس موڑ پر لے آتی ہے جہاں قوم کی خوشحالی اور قوم کی حقیقی عظمت اس کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید نے فطرت کے اس اصول کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ کہ جب کوئی قوم اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا شروع کرتی ہے تو فطرت اس کام میں بھی اس کی مدد کرتی ہے اور تاریخِ عالم بھی اس کی شاہد ہے کہ ایک قوم پر دوسری قوم مسلط ہوتی آئی ہے۔ اقبال نے بھی ملت کے زوال پر آمادگی کو بھانپ کر اس خطرے کو یوں بیان کیا ہے ؏

محفلِ ما بی مے و بی ساقی است!
سازِ قرآن را نوا ہا باقی است!

زخمهٔ ما بی اثر افتد اگر!
آسمان دارد هزاران زخمه ور

ذکرِ حق از امتان آمد غنی!
از زمان و از مکان آمد غنی!

ذکرِ حق از ذکرِ هر ذاکر جداست
احتیاجِ روم و شام او را کجاست
حق اگر از پیشِ ما بر دارش
پیش قومی دیگر بگذاردش!

از مسلمان دیده ام تقلید و ظن
هر زمان جانم بلرزد در بدن

ترسم از روزی که محرومش کنند!
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

(جاوید نامه، ۹۱-۹۲)

حکیم اُمّت اس خطرے کو بھانپتے ہوئے اس حقیقت سے بھی غافل نہیں تھا کہ جہاں مسلمان کی تقدیر روبہ زوال ہے وہاں مغرب اپنی مرکزیت کو مضبوط کر رہا ہے اور اندرونِ ملک ساتھ کا ہمسایہ بھی اپنے استحکام کے لئے دن رات کوشاں ہے۔

لُردِ مغرب آں سراپا مکر و فن
اہلِ دیں را داد تعلیمِ وطن

او بفکرِ مرکز و تو در نفاق
بگذر از شام و فلسطین و عراق

(جاوید نامہ، ۶۷)

نگہ دارد برہمن کارِ خود را
نمی گوید بہ کس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر
بدوشِ خود برد زنّارِ خود را

(ارمغانِ حجاز، ۱۳۷)

شاعرِ ملّت قوم کو اس حیص بیص کے عالم میں دیکھ کر یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ اس زبوں حالی کے لئے تنہا قوم ہی ذمّہ دار نہ تھی۔ خدا اندیشی اور حق پرستی کی تردیج داشاعت

کا اجارہ جن لوگوں نے لے لیا تھا اقبالؔ اُن سے قطعاً مطمئن نہ تھا۔ رسمی مُلّا اور دین کے نام نہاد پیشواؤں کے خلاف اس نے مستقل جہاد کیا اور پھر علی الاعلان کہا کہ

مسلم ایں کشور از خود ناامید
قرن ہا شد با خدا مردی ندید

اس کے ساتھ ہی اس نے مسلمان کی توجہ اس امر کی طرف بھی دلائی ہے

چوں سُرمۂ رازی را از دیدہ فروشستم
تقدیرِ امم پنہاں پنہاں بکتاب اندر

لیکن اس سے کیا ہوتا تھا۔ کہنے والا اپنی بات کہتا رہا۔ کچھ لوگ اسے غور سے سُنتے رہے اور کچھ اسے محض دیوانے کی بڑ سمجھتے رہے۔

اور جب ہم ۱۹۴۷ء کی تاریخی حقیقت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اور تاریخ پر جذبات کے پھیلے ہوئے پردے ہٹانا چاہتے ہیں تو ہمارے سامنے کئی سوالات آتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ

۱۔ کیا علامہ اقبالؔ کے ذہن میں یہی بات تھی جو معرضِ وجود میں آئی؟

۲۔ کیا پاکستان بننے کے بعد عنتر اندلیاسِ حیدری کا قلع قمع ہوا یا اس کو مزید فروغ حاصل ہوا؟

۳۔ کیا اس ملّت نے ’جعفر و صادق‘ کے پیرووں کو ختم کر دیا یا ان کو اپنی

من مانی کارروائیاں کرنے کی اجازت دے دی۔

۴۔ کیا "آئینِ رسولِ مختار" کی ترویج ہوئی یا اس کی اشاعت کے دروازے بدستور بند رہے؟

۵۔ کیا "قبائے خسروی" پہننے والوں نے "درویشی" اختیار کی یا وہ بدستور ناخدا اندیش رہے؟

۶۔ حق پرستی کا شعار ملّت نے اختیار کیا یا "قومی فروختند و چہ ارزاں فروختند" کی داستانِ ماضی پر عمل ہوتا رہا؟

بظاہر ان سوالوں کا صحیح جواب دینا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ آپ جس ہنگامے کے عین وسط میں کھڑے ہوں آپ اس کے امتداد و تاثر کو کما حقہٗ جانچ نہیں سکتے۔ منظر کی وسعت سے ذرا دور ہٹ کر ہی اس کے صواب و ناصواب کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اور اقبال اس کیفیت کو "شمشیر و سناں" سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اس نقطۂ عروج سے پھر تقدیرِ اُمت مائل بہ زوال رہی۔ اقبال کے بقول "طاؤس و رباب" کا زمانہ شروع ہوا، کیونکہ ملّت نے رفتہ رفتہ ان تمام معائب کے لئے اپنی آغوش وا کر دی جس کا رونا حکیمِ اُمت ساری عمر روتا رہا۔ یہ حکم لگانا مشکل ہے کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ!

کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

(بالِ جبریل، ۹۷)

اور ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات حال کے جائزوں کی تردید کر دیں۔ لیکن وقت آگیا ہے کہ ہم دیانت داری سے اس امر پر غور کریں کہ تقدیرِ اُمّت کا رُخ کیا ہے اور اگر اقبالؔ کے بقول یہ کیفیت ہے کہ ؎

ترسم از روزی کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

تو علّامہ اقبالؔ ہی کے ارشادات کی روشنی میں تقدیرِ اُمّت کی بہتری کے وسائل تلاش کریں۔

حضرت علّامہ نے 'پیر و مرید' میں اس حقیقت کی طرف لطیف لیکن واضح اشارہ کیا ہے:-

مریدِ ہندی

زندہ ہے مشرق تری گفتار سے
اُمتیں مرتی ہیں کس آزار سے

پیرِ رُومی

ہر ہلاکِ اُمّتِ پیشیں کہ بُود!
زانکہ بر جندل گماں بردند عود (بالِ جبریل، ۱۸۴)

مس اے۔ عبدالرحمٰن

اقبال ایک مصلح

قانونِ قدرت یہی ہے کہ جب خداوند تعالیٰ کو کسی قوم کو زندہ کرنا مقصود ہوتا ہے تو وہ اپنے بندوں میں سے کسی کے دل میں اسے بیدار کرنے کی تڑپ پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ ایک بار پھر رحمتِ خداوندی نے جوش مارا اور اس نے علامہ اقبال جیسی ہستی کو پیدا کر دیا۔ جس کی آواز نے مردہ دلوں میں رُوح پھونک دی اور بے حس قوم میں زندگی کے آثار پیدا کر دیئے۔

اقبال کی شاعری تحفۂ خداوندی تھی اور خداداد قوتوں کا مجموعہ۔ اقبال ایک روشنی کا مفکر۔ ایک بلند پایہ اور بے نظیر فلاسفر۔ ایک ماہرِ سائنس۔ اعلیٰ درجہ کے سیاستدان۔ رگ شناس حکیم۔ مخلص رہبر۔ بہترین مدبر اور سب سے بڑھ کر ایک قابلِ فخر اور آتشِ بیان شاعر تھے۔

آپ کی شاعری میں فلسفہ۔ سائنس۔ دردِ قوم اور حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ آپ مسلمانوں کے جمود کو دیکھ کر تڑپ جاتے۔ آپ ایک پیغامبر بننا چاہتے تھے جو مسلمانوں کی اخلاقی۔ جماعتی اور سیاسی کمزوریوں پر آنسو بہا کر ان کو ان آنسوؤں میں تیرا دے۔ اور ان کو شاندار ماضی کی یاد دلا کر ان کے دلوں کو گرما دے۔ چنانچہ آپ جوانانِ اسلام کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ؎

کبھی اے نوجوانِ مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

اور پھر ان کا مقابلہ اسلاف سے اس طرح فرماتے ہیں ؎

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا!

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

وہ مسلم کی اس زبوں حالی پر تڑپ جاتے ہیں اور اس تڑپ کا اظہار یوں فرماتے ہیں۔

تیرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مُسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

اس خطرے سے آگاہ کرنے کے بعد مسلمان کو بچنے کی تدابیر کی طرف لانے کی سعی فرماتے ہوئے یوں اظہارِ خیال فرماتے ہیں ؎

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے!
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں!
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنیوالی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

قوم کی بے حسی اور خدا سے دوری کو دیکھ کر تڑپ جاتے ہیں۔ بدرجۂ اتم پریشان ہوتے ہیں اور بے بس ہو کر خدائے لم یزل کے حضور دست بدعا ہو جاتے ہیں اور اس کی رحمت کو ان الفاظ میں پکارتے ہیں ؎

یارب دلِ مُسلم کو وہ زندہ تمنّا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر
خودداریٔ ساحل دے آزادیٔ دریا دے

اقبال ایک ماہرِ نفسیات کی طرح مسلمانوں کی خامیوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اور انہیں یقین تھا کہ مسلمانوں کی زبوں حالی کا ایک بڑا سبب ان کی فرقہ بندی ہے۔ چنانچہ اسی فرقہ بندی پر ان الفاظ میں آنسو بہاتے ہیں ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں!!
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں!

وہ باوجود ان تمام باتوں کے اُمتِ محمدیہ سے مایوس نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

نہیں نا اُمید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اقبالؔ خودی کو قیامِ حیات کا ذریعہ یقین کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے فاتی کمالات اور فطری صلاحیتوں سے باخبر ہو۔ ان کی دیکھ بھال کرے۔ ان کو بروئے کار لائے اور ان سے پورا پورا استفادہ کرے۔ وہ اس مقولہ کی تفصیل سے پوری طرح آگاہ تھے۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔

چنانچہ آپ کا ایمان تھا کہ خودداری ہی میں وہ صفات ہیں جو کسی قوم کو نہ صرف زندہ رکھ سکتی ہیں بلکہ انہیں اوجِ کمال تک پہنچا سکتی ہیں۔ وہ مسلمان کو توکل سے ہٹا کر عملی زندگی کی طرف لانے کی کوشش کرتے تھے اور ان کے اندر یقینِ محکم پیدا کرنے کے متمنی تھے۔ مندرجہ ذیل اشعار انہی خیالات کے آئینہ دار ہیں ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال کا تصورِ آدم وہ تصور ہے جو قرآنِ کریم نے پیش کیا۔ جس میں انسان کامل ہے اور خلیفۃ اللہ کے نام سے موسوم ہوا ہے۔ وہ اس لئے پیدا ہوا ہے۔ کہ کائنات کو مسخر کرے۔ وہ احسن الخالقین اور خدا کی خدائی کا شاہکار ہے۔

لیکن جب وہ زمانۂ حاضرہ کے انسان کو دیکھتے اور اسے اسفل السافلین پاتے تو پریشان ہو جاتے اور اپنی اسی پریشانی کو یوں اظہار فرماتے ؎

یہی انساں ہے سلطاں بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بینی نہ خدا بینی نہ جہاں بینی
یہی شاہکار ہے تیرے ہنر کا؟

اقبال کا شکوہ زبانِ زدِ عام ہے اور اکثر لوگوں نے اسی کے باعث انہیں مطعون بھی قرار دیا۔ لیکن جو جذبہ اس کے تحت کام کر رہا تھا۔ اس کو بہت کم

لوگ سمجھ پائے۔ دراصل شکوہ میں اقبال نے مسلمانوں پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ دوسری اقوام کی طرح مسلمان بھی اس خوش فہمی میں مبتلا نہ رہیں کہ ہم خدا کی منتخب قوم ہیں لہٰذا ہمیں کسی حالت میں بھی خدا دوسروں کے مقابلے میں ذلیل نہیں کرے گا۔ ہمارے اعمال خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ اور نہ ہی ہم مغلوب ہوں گے۔ چنانچہ جب ادبار کی گھٹائیں اٹھیں تو مسلمان حیران رہ گیا۔ کہ کیا ہوا اور کیوں ہوا۔ گویا شکوہ میں اقبال نے عام مسلمانوں کی دلی کیفیت کو بیان کیا ہے کہ مسلمان یوں کہتے ہیں، یوں سوچتے ہیں اور یوں محسوس کرتے ہیں۔ ان کے جذبات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے

اُمتیں اور بھی ہیں اُن میں گنہگار بھی ہیں!
عجز والے بھی ہیں، مستِ مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ تیرے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر!
یہ شکایت نہیں ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حُور و قصُور
اور بے چارے مسلماں کو فقط وعدۂ حُور

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

اس کو بیان کرنے کے بعد خود ہی ان کو اس ادبار کی وجہ بھی بتلاتے ہیں اور اس طرح ایک نہایت حسین طریق سے ان کی توجہ اصلاحِ قوم کی طرف مبذول فرماتے ہیں ؎

کس قدر گراں تم پہ صبح کی بیداری ہے!
ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے
تمہیں کہہ دو یہی آئینِ وفاداری ہے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے
میرے کعبہ کو جبینوں سے بسایا کس نے
میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے
تھے وہ آبا، تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟

ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

آخر میں مسلمان کو تسلی دیتے ہیں کہ مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر اب بھی مسلمان بیدار ہو جائیں تو آج بھی وہ حالات پیدا ہو سکتے ہیں اور وہ ان مقامات کے مستحق ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ رہے۔ اور ان خیالات کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اقبالؔ کو خراجِ تحسین ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم سب جذبۂ صادق پیدا کریں۔ زندگی کی جو حرارت وہ مسلمان کے اندر پیدا کرنے کے خواہشمند تھے اس کو اپنے اندر پیدا کریں، عزمِ صمیم لے کر اٹھیں۔ عملی زندگی میں نمایاں تغیر پیدا کریں۔ فرقہ پرستی ختم کریں۔ خالقِ حقیقی سے لو لگائیں اور زندگی کا ہر لمحہ خدمتِ خلق کے لئے وقف کر دیں۔ تعمیرِ ملت اور اس کے استحکام کو زندگی کا مقصد بنالیں۔ تاکہ ہمارا شمار بھی زندہ اور باوقار قوموں کی صفوں میں ہو۔ اور ہر وقت خدا تعالیٰ کے اس اصول کو یاد رکھیں۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ۔

خدا نے اُس قوم کی تقدیر کبھی نہیں بدلی جنہوں نے اس کو بدلنے کے لئے خود کوشش نہیں کی۔

علی حضور نجفی

اقبال کا مسلمانوں سے خطاب

آج ہم سب لوگ علامہ اقبال کی برسی منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔
اور ہر ایک اس میں حصّہ لے رہا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم کو ظاہری طور پر ہم سے جدا ہوئے کچھ ہی عرصہ گزرا ہے۔ لیکن ان کے کلام میں ہمارے لئے بہت سے پیغامات مضمر ہیں۔ جو ہمیں ہر وقت اپنی انفرادی اور اجتماعی جدوجہد میں مشعلِ راہ کا کام دیتے رہیں گے۔ کوئی قوم بھی اس وقت تک صحیح طور پر ایک قوم کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنے محسنوں کو یاد نہیں کرتی اور اپنے تابناک ماضی سے رابطہ قائم نہیں رکھتی۔ اگرچہ صرف ماضی سے رابطہ کافی نہیں لیکن قومیں اپنے درخشندہ ماضی کا سہارا لے کر آئندہ میدانِ عمل میں سرگرمِ عمل رہتی ہیں۔ اور اس سلسلہ میں علامہ اقبال نے مسلمانوں کو مختلف

اوقات میں مختلف طریقوں سے مخاطب کیا ہے اور ان کو ماضی کا سہارا دے کر مستقبل میں دعوتِ عمل دی اور تابناک ماضی کے آئینے میں درخشندہ مستقبل کی خوشخبری دی ہے۔

علامہ اقبال مسلمانوں سے ان کے اسلاف کی بابت کہتے ہیں ؎

کبھی اے نوجواں مُسلم تدبّر بھی کیا تو نے ؟
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں!
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سردارا
تمدّن آفریں اخلاق آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارہ!
سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا
اگر چاہو تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں

مگر تیرے تصوّر سے فزوں تر ہے وہ نظّارہ
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت وہ سیّارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریّا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ ایک عارضی شئے تھی
نہیں دُنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا!
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی!
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

ایک دوسری جگہ مسلمانوں کا تذکرہ ایک مثال میں کرتے ہیں اور ظاہری طور پر مرغِ سرا اور مرغِ ہوا کے مکالمے کی صورت میں نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

اک مرغِ سرا نے یہ کہا مرغِ ہوا سے!
پرواز اگر تو ہے تو کیا یہ نہیں پرواز
گر تو ہے ہوا گیر تو میں بھی ہوں ہوا گیر
آزاد اگر تو ہے تو نہیں میں بھی گرفتار
پروازِ خصوصیت ہر صاحبِ پَر ہے
کیوں رہتے ہیں یہ مُرغِ ہوا مائلِ پندار

Acc. 11759

مجروح حمیت جو ہوئی مُرغِ ہوا کی !!
یوں کہنے لگا سُن کے یہ گفتار دل آزار
کچھ شک نہیں پرواز میں آزاد ہے تو بھی
حد ہے تیری پرواز کی لیکن سرِ دیوار
واقف نہیں تو ہمتِ مُرغانِ ہوا سے
تو خاک نشیمن ۔ انہیں گردوں سے سروکار

علّامہ اقبال مسلمانوں کو اُن کی تاریخ بار بار یاد دلا کر ان کے ذہنوں میں اس یاد کو تازہ کرنا چاہتے تھے کہ وہ کیا تھے۔ اور کیا بن سکتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں فانی، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
تیری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوّت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تُو ہے

علّامہ مرحوم جہاں مسلمانوں کو ان کے ماضی کے متعلق بتاتے تھے۔ وہاں ان کی توجہ اپنے حال کی طرف بھی مبذول کراتے تھے کہ کہاں وہ لوگ تھے اور کہاں ہم لوگ ہیں۔ ان کی رفعتوں سے ہماری پستیوں کا مقابلہ کر کے موجودہ مسلمانوں کو دعوتِ عمل دیتے تھے۔ خاص طور پر نوجوانوں کی اصلاح کے علمبردار تھے کیونکہ کوئی قوم اصل میں اس وقت تک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوتی جب تک اس قوم کے نوجوانوں میں عمل کا جذبہ نہ ہو۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مُسلمانی!

دوسری جگہ لکھتے ہیں ؏

یقیں محکم، عمل پیہم، محبّت فاتحِ عالم

جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

علامہ اقبالؔ مسلمانوں کی مثال اکثر شاہین سے دیا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی نظر میں شاہین کے مزاج کی کیفیت صحیح مسلمان کے مزاج کی کیفیت سے قریب تر ہے۔ ان کے اشعار میں اکثر و بیشتر شاہین کا تذکرہ صرف اشارۃً ہوتا ہے۔ اصل میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہیں کہیں یہ کہہ کر کہ ع

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ ہر مسلمان صرف ظاہری بادشاہت کا قائل نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی دولتِ دُنیا اکٹھا کرنا اس کا کام ہوتا ہے۔ دوسری جگہ زندگی کی سختی میں لذت پیدا کرتے کو اور زندگی کی جدوجہد سے لطف اندوز ہونے کو اس پیرائے میں بیان کیا ہے۔

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سال خورد
ہے ترے شہپر کو آساں رفعتِ چرخِ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

دیکھئے مندرجہ ذیل اشعار میں اس کہانی کے مثبت پہلو کو کس طرح اجاگر کر کے بیان کیا ہے ؎

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّیٰ
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوانِ ترو تازہ معرّیٰ نے جو دیکھا!
کہنے لگا وہ صاحبِ غفران و لزومات
اے مُرغکِ بیچارا ذرا یہ تو بتا تُو
ترا دہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تُو
دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

مُسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے اقبال نے ایک مردِ مومن کا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ ایسے تصوّرات اپنے سامنے رکھ کر میدانِ عمل میں قدم بڑھانا چاہیئے۔ ملاحظہ ہو ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن!
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ہو ٹھنڈک وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمان

علامہ اقبال مسلمانوں کی صلاحیتوں کے قائل ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ مسلمان اب بھی رہنمائی کے قابل ہیں۔ ان کو اپنے آپ کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؏

یہ نکتہ سرگذشتِ ملّتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

علامہ اقبال مسلمانوں کو آئندہ اقوامِ عالم کا راہنما سمجھتے ہوئے موجودہ حالت سے ہرگز مایوس نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے خیال میں اتنے دنوں کی بے تابیگی مسلمانوں کی چنگاری کو سرد نہیں کر سکتی۔ کہتے ہیں ؎

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خواب بھی بے خواب ہے
کس قدر نشوونما کے واسطے بے تاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی، خود فزائی کے لئے مجبور ہے
سردیٔ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے
ہے لحد اس قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند

دوسری جگہ مسلمانوں کو بیدار کرتے ہوئے اور دعوتِ عمل دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

مسلمِ خوابیدہ اُٹھ ہنگامہ آرا تُو بھی ہے
وہ چمک اٹھا اُفق گرمِ تقاضا تو بھی ہے

وسعتِ عالم میں رہ پیما ہو مثلِ آفتاب
دامنِ گردوں سے ناپیدا ہوں یہ داغِ شہاب
کھینچ کر خنجر کرن کا پھر ہو سرگرمِ ستیز
پھر سکھاتا ریگِ باطل کو آدابِ گریز

عمل کی دعوت دیتے دیتے علّامہ اقبال مسلمانوں کو تہذیبِ مغرب کے طلسم میں پھنسا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے بلکہ وہ مُسلمان کو اپنی تہذیب و ثقافت کا خود آئینہ دار بنانا چاہتے ہیں۔ لکھتے ہیں ؎

خیرہ نہ کر سکی مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

آخر میں مغربی اقوام کو خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کو ایک یقینی پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خارزار ہوگا!
دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہی زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی

ادبیاتِ معاصرِ ایران پر اقبال کا اثر

اپنی زندگی کا ایک طویل اور پر حادثہ حصّہ ایران میں گزارنے کے بعد تقریباً چار سال قبل جب میں واپس آیا تو تمام ادبی اور تعلیمی حلقوں کی طرف سے مجھ سے سوال کیا جاتا کہ آج کل کے ایران میں اقبال کے کلام کو کیا اہمیت ہے اور میرے جواب سے پہلے ہی بعض دوست کہہ دیتے کہ وہاں تو غالباً اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ آج سے کوئی دس سال پہلے میں نے اپنے ہم وطن اصحاب کے اسی قسم کے استفسارات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک کتاب کی شکل میں بعض معروف ادبی اور علمی ایرانی شخصیتوں کے مقالات اور منظومات سے اقتباسات جمع کر دیئے تھے اور یہ کتاب اقبال اکادمی کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اقبال میں دلچسپی رکھنے والے

اشخاص کسی حد تک ایرانیوں کی آراء سے آشنا ہو چکے ہوں گے اور یقیناً بعض اقبال کے عقیدتمند اور اہلِ دل اُن تاریخی اشعار کو نہیں بھولے جن میں ایران کے سب سے بڑے شاعر اور سیاستمدار شاعر، ملک الشعراء بہار نے اقبال کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ لیکن عام طور پر ہمارے نئے ادیب اور دانشمند اور نوجوان اہلِ فکر اقبال کو 'پرانا' خیال کر کے بالائے طاق یا طاقِ نسیاں میں جگہ دینے کی کوشش میں ہیں۔ اپنے انہی خیالات اور تصوّرات کی فرضی حمایت میں وہ ایرانیوں کے اظہارات کی بھی من مانی تعبیریں کرنے سے نہیں چوکتے۔

یہ چند الفاظ میں نے تمہید کے طور پر عرض کئے ہیں ورنہ عقیدت، ذوق یا عشق بحث مباحثہ کا موضوع قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ اور مجھ خاکسار کو اگر کسی سرمایہ یا مایہ پر فخر ہے تو وہ علامہ مرحوم سے محض سادہ عقیدت اور ارادت ہے اور جہاں کہیں اقبال کو مجھے پیش کرنے کا موقع ملا ہے میں نے صرف ایک عقیدتمند کی حیثیت سے پیش کیا ہے ورنہ فن شاعری، زبان کی نفاست اور محاورہ، فلسفہ کے مختلف و متضاد پہلو میری ذہنی اور وجدانی حدود سے باہر ہیں۔

علامہ مرحوم کی قدرتی طور پر آرزو تھی کہ وہ معلوم کریں کہ اہلِ ایران اُن کے فارسی کلام کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ علامہ مرحوم کے خطوط جو انہوں نے

استاد سعید نفیسی کو ۱۹۳۲ء میں لکھے اس امر کے شاہد ہیں۔ استاد نفیسی جو وفات پا گئے ہیں۔ اس وقت ابھی نوجوان ادبا اور شعرا میں شمار ہوتے تھے لیکن اس وقت بھی علم و فضل کی دُنیا میں ان کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ انہوں نے اقبال کے کلام کی تعریف کی اور ان کی ہمت افزائی کی۔ افسوس کا مقام ہے کہ اقبال کے دو خط تو استاد نفیسی کے پاس موجود تھے لیکن نفیسی کے جوابی خطوط کا کوئی سُراغ نہیں مل سکا۔ لیکن ایران معاصر کے جس عالی مقام استاد اور شاعر نے سب سے زیادہ مقالے اقبال کے کلام و پیام کی تمہید و تفسیر میں لکھے ہیں وہ استاد نفیسی ہی ہیں۔ یہاں ان کے متعدد و مفصل مقالات سے اقتباس پیش کرنا ممکن نہیں۔ صرف اتنا کہنا ہے کہ استاد نفیسی پر اسرار و رموز کے مطالعہ کا اتنا اثر ہوا کہ ہر قسم کے تعصب اور وقت کی مصلحتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے انہوں نے کہہ دیا کہ سات سو سال سے کسی کو جرأت اور ہمت نہ ہوئی کہ مولانا روم کی مثنوی کے طرز پر مثنوی تالیف کرے۔ اقبال نے نہ صرف یہ ہمت کی بلکہ اس نہایت مشکل کام میں پورے طور پر کامیاب ہوا۔ آپ جانتے ہیں کہ مثنوی مولانا روم کو قرآن در زبانِ پہلوی یا قرآنِ عجم کہا جاتا ہے۔ اور استاد نفیسی مثنوی اقبال کو مثنوی عصرِ حاضر کا نام دیتے ہیں۔ یہ رسمی تعریف و تقریظ نہیں۔ نفیسی کا احساس اور تاثر ہے جس کا تعلق دل سے ہے علم و دانش سے نہیں۔ تطہیرِ فکر سے ہے جذبات زود گزر کی تحریک یا تسکین سے نہیں۔ اپنے ایک مقالے میں انہوں نے سیالکوٹ کی قونیہ سے مماثلت کا ذکر کرتے

ہوئے فرمایا ہے اہلِ سیالکوٹ کے لئے وہ فارسی جملہ نقل کرتا ہوں تاکہ ان کے دلوں میں اس شہر کی معنوی عظمت کا احساس تازہ اور مزید مستحکم ہو جائے۔ اُستاد لکھتے ہیں۔

ہُمان فکری کہ در تونیہ مولانا را بسخن گفتن در اداشت ہفتاد سال بعد در سیالکوٹ تا رو پود مسعود محمد اقبال را بہم یافتہ است۔

ہمارے یہاں کی طرح ایران میں بھی ادبیات کے کئی مکتب وجود میں آچکے ہیں۔ ان نئی طرزوں کو جو مغربی ممالک کے قدیم و جدید ادبا و شعرا کی پیروی میں اختیار کی گئی ہیں۔ مکتب یعنی سکول یا سٹائل کا نام دینا ایک نامناسب مبالغہ ہی ہے لیکن چونکہ ہمارے جدید شعراء خواہ وہ مُلکی ہوں یا ایرانی اپنے نئے تجربوں کو 'مکتب' کے نام سے متعارف کرتے ہیں۔ ہمیں اس اصطلاح کے استعمال پر کوئی اعتراض نہیں۔ اپنے ملک کی جدید شاعری کے باقاعدہ مطالعہ کا مجھے موقع نہیں ملا اس لئے اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا۔ البتہ ایرانِ معاصر کے جدید اہلِ شعر عام طور پر کلاسیک طرز اور قدیم مکاتیبِ شعر کو عصرِ حاضر کے تقاضوں کے منافی خیال کرتے ہیں۔ اور بعض پرجوش حضرات تو موجودہ عصر میں 'کلاسیک' مکتب کے شعراء پر شخصی تنقید اور حملہ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ جدید شعرِ شعراء کے مطالعہ سے ایک بات مجھ پر ظاہر ہو گئی اور وہ یہ کہ عصرِ حاضر کی ذہنی، معاشی اور دیگر کشمکشیں ان کو فرصت ہی نہیں دیتیں۔ کہ وہ اپنی قدیم ادبیات اور ادبی روایات کا آرام

اور سکون اور ٹھنڈے دل سے مطالعہ کر سکیں۔ نظامی عروضی کی پیش کردہ شرائط کہ ایک شاعر بننے کے لئے قدیم بڑے بڑے شعراء کا مطالعہ ہی نہیں بلکہ ان کے ہزار ہا اشعار حفظ کرنا بھی ضروری ہے جدید شاعر کے لئے مشکل ہے۔ اس لئے آسان تر راستہ انتخاب کر لیا ہے۔ زبان، بحر و وزن سے آزادی کے ساتھ ساتھ فکری ربط اور ہم آہنگی پر بھی ضروری توجہ ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ اور بعض اوقات تو مطلب اور موضوع سمجھنے میں بھی مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ بہرحال خارہم میر دیا زیاد بہار کا یہ پہلو بھی معاصر الجھنوں اور انحرافات کا آئینہ ہونے کے لحاظ سے اپنی جگہ قابلِ توجہ ہے۔ لیکن یہ بات بہت اہم اور قابلِ ذکر ہے کہ ابھی تک اس قسم کے تجربوں کو تعلیمی نصاب میں جگہ نہیں دی گئی۔ ہمارے ہاں بھی غالباً وضع حال کچھ ایسی ہی ہے۔

بہرحال ایران معاصر میں قدیم اور جدید کے درمیان اختلاف، نزاع اور چپلقش کے باوجود تقریباً دونوں قسم کے شعراء ادبیات فارسی کا سب سے بڑا نمائندہ اور ایرانی شاعری کا بلند ترین مظہر متفقہ طور پر ملک الشعراء بہار کو خیال کرتے تھے۔ بہار نے کلاسیک و قدیم مکاتیب کے دوش بدوش وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیتے ہوئے کئی جدید بحریں، جدید طرز کلام کو رواج دیا حتیٰ کہ بہت سے عوامی گیت بھی لکھے اور کلام میں جدتِ بیان اور ندرتِ بیان پیدا کرنے کی غرض سے مثنوی مستزاد بھی لکھی جو بقول ڈاکٹر خطیبی ایک نئی اختراع ہے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہ امر نہایت عجیب اور غیر مترقبہ تھا کہ سب سے پہلے اور غیر معمولی شدت کے ساتھ جو شاعر اقبالؔ سے متاثر ہوا وہ بہار تھا۔ یہ بات اور بھی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بہار کا حقیقی کمال اور اس کی حیاتِ شعری کا بہترین سرمایہ اُس کے قصائد ہیں۔ اور باقی انواعِ سخن یعنی غزل، رُباعی، مثنوی وغیرہ محض جزوی اور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

لیکن جب ہم بہار کی داستانِ حیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ شعری ذوق و فنِ شعر سے قطع نظر بہار میں فطرتاً ایک قومی مصلح اور راہنما کی رُوح کارفرما تھی۔ اُس کی زندگی کا اوّلین و آخرین مقصد قوم کی خدمت تھا۔ اور میرے خیال میں بنیادی انسانی قدروں کے متعلق یہی اشتراکِ فکر و نظر تھا جس نے بہار پر اتنا گہرا اثر کیا کہ اقبالؔ کے متعلق اس نے نہایت غیر مبہم لفظوں میں کہہ دیا کہ سخن سرائی کی تمام اعلیٰ قدریں اقبالؔ کے کلام میں جمع ہیں اور عصرِ حاضر کو عصرِ اقبالؔ کہنا مناسب ہوگا۔ رُوحِ مکتبِ اسلام اور طرزِ کلام تمام مکاتیب کا مجموعہ ہے اور تاریخِ ادبیات میں اس کا مناسب نام مکتبِ اقبالؔ بھی ہو سکتا ہے۔

یہ الفاظ بہار نے ۱۹۴۲ء میں ایرانی و ہند کلچرل ایسوسی ایشن کے افتتاح کے موقع پر اپنے منظوم مقالہ یا خطابہ میں کہے۔ لیکن اس خراجِ تحسین سے کہیں زیادہ قابلِ اہمیت یہ بات ہے کہ اسی خطابہ میں بہار نے

اقبال کے طرز پر اور قریباً قریباً اُسی کی زبان میں اشعار کہے اور ایک دو شعر پر تضمین بھی کی۔
بہار ہندوستان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

شمۂ ای از حال و استقبال تو
ایں نہ من گویم کہ گفت اقبال تو
زندگی جہد است و استحقاق نیست
جُز بعلم انفس و آفاق نیست
گفت حکمت را خدا خیر کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر
غافل از اندیشۂ اغیار شو
قوتِ خوابیدہ ای بیدار شو

پھر اقبالؔ ہی کے اندازِ بیان میں اضافہ کرتے ہیں۔

نا اُمیدی حربۂ اہرمین است
پیشش رفت و آسمانی جوشن است
جوشنِ امید را بر خود بپوش !
روز و شب تا جان بتن داری بکوش
خویش را خوار و زبوں کس مدان
در نبرد زندگی واپس مدان !

زین قناعت پیشگی پرهیز کن
مرکب همت بجولان تیز کن
همت از آمال کوچک باز گیر
تا فرازِ کہکشان پرواز گیر
این کسالات و تن آسانی بس است
تربیت آموز، نادانی بس است
زندگی جنگ است و تدبیر معاش
زندگی خواهی چو مردان کن تلاش
فقر و درویشی، در استغنا نکوست
باغنا شو صوفی و درویش دوست

فقر و درویشی نباهت میکند
در دو عالم روسیاهت میکند
گر تری در دو رنجت در قناست
خیز و جنبش کن که گنجت زیر پاست

از جدائی بگذر و مانوس باش

قطرگی بگذار و اقیانوس باش
کُفر دانی چیست، کثرت ساختن!
از یکی سو می دو تائی تاختن!

بہار نے نہ صرف اقبال کا طرزِ کلام اپنایا ہے بلکہ اس کی مبہم تعلیمات کا خلاصہ بھی بیان کر دیا ہے اور اس جدید نظریۂ ادب کی تردید بھی کر دی ہے۔ جو تعلیم، تلقین و تہذیب کو شاعر اور شاعری کی حدود سے خارج سمجھتے ہیں۔ حقیقت امر یہ ہے کہ خطابت، کو خلوصِ بیان اور حرارتِ عشق سے اُس مقام پر پہنچا دینا کہ وہ براہِ راست سُننے والے یا پڑھنے والے کے دل میں اتر جائے ایک عام سخن ساز یا شعر ساز کا کام نہیں۔ یہ مقام بقول حضرت عطار پیغمبری کا جُزو ہو جاتا ہے۔ یہاں تک پہنچنے کا راستہ 'حال' ہے 'قال' نہیں۔ مرحوم ملک الشعراء بہار نے (استاد نفیسی کی طرح) اس بات کا اقرار کیا ہے کہ یہ شاعرانہ پیغمبری عصرِ حاضر میں اقبال ہی کے حصّہ میں آئی ہے۔ اقبال کو خراجِ تحسین بھی پیش کیا اور اُس کی پیروی میں چند اشعار بھی لکھے۔ اور انہوں نے اقبال کو اہلِ ایران کے سامنے پیش کرتے ہوئے اس کا فردوسی طوسی، احیا کنندہ ملّتِ ایران سے تشابہ کا ذکر کیا اور کہا کہ اقبال کا کلام ہماری نو سو سالہ ادبی اور اسلامی جدوجہد کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہوگا کہ ایران کی ادبی تاریخ میں بلند ترین مقام

'فردوسی، مولانا روم، سعدی کو حاصل ہے۔ البتہ صوفیانہ غزل اور رنگِ غنا میں حافظ کا ایک بلند اور جُدا مقام ہے۔

بہار نے اقبال کی فردوسی سے شباہت کا ذکر کر کے ایرانی اہل فکر و نظر کی توجہ اقبال کی اُن خدمات کی طرف مبذول کی جو اس نے انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی آزادی کے لئے انجام دیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ بہار کے بعد ایران کے سب سے مقتدر شاعر صادق سرمد نے اقبال کو اپنا ہیرو بنالیا۔ اور ہر رائے ہنر کی مخالفت شروع کر دی۔ اس نے بار بار اُن حقائقِ حیات کو دہرایا جو اقبال نے بیان کئے ہیں اور خود بھی اقبال کے نظریات کی پیروی میں نظمیں لکھیں۔

ایران کے مشاہیر علم و ادب کے نزدیک ایران کی شاعری کا بلند ترین نمونہ قصائد ہیں۔ جس شاعر کو الفاظ و اصطلاحات علم و ادب، اشاراتِ تاریخی وغیرہ پر غیر معمولی قدرت ہو اُسی کو قصیدہ سرائی میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ اُستاد ڈاکٹر حسین خطیبی (جو تہران یونیورسٹی میں 'سبک شناسی' کے استاد ہیں) نے کئی بار اظہار فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص فارسی زبان میں شعر و شاعری کا عالی ترین نمونہ دیکھنا چاہتا ہے تو وہ سبک خراسانی کے بڑے بڑے شعراء مثلاً فرخی، عنصری، انوری، خاقانی، قاآنی اور بہار ایسے شعراء کے قصائد کا مطالعہ کرے۔ کیونکہ زورِ کلام، شاعرانہ صنائع لفظی و معنوی کا اور کسی صنفِ شعر میں قصیدے کے برابر مظاہرہ نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ کلام یہ کہ قصیدہ صرف

ایک عالم، ادیب اور فنِ شعر میں غیر معمولی مہارت رکھنے والا شاعر ہی نباہ سکتا ہے۔ اب سرمد جو بہار کے بعد سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر تھا اور الفاظ پر قدرت وصنائع بدائع کے استعمال میں مہارت رکھتا تھا اقبال کے زیرِ اثر آنے کے بعد شعر اور شاعر کے فرائض کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

آئینِ شعر گرچہ بدین پای بند نیست!
بہ علم و فن سزد کہ بہ ہر جا وطن کنند
لیکن سخن وران را تنہا وظیفہ نیست
بازی لفظ از پی موزون شدن کنند
بر شاعران نزید تنہا ز نظم شعر
آہنگ سازی از جہت نغمہ زن کنند
بر شاعران رسد کہ بہ تبلیغ دین وداد
از مردمِ ستم زدہ دفع محن کنند
بر شاعراں رسد کہ بنای شریعتی
یا نہضتی بزرگ بدستِ سخن کنند

اور پھر فرماتے ہیں ؎

ترویج معرفت بود آئین شاعری!
دین خود رسالتی است کہ بر ما مجاز گشت

ایک جگہ اقبال کے کلام و پیام کا ذکر کرتے ہوئے سرمد نے کہا ہے کہ شاعر کو بعض اوقات شعر گو اور گاہی ملہم من اللہ بھی کہا گیا ہے اور اقبال میں یہ دونوں کیفیتیں یکجا موجود ہیں۔ غالباً آپ کے ذہن میں علامہ اقبال کے بعض اشعار جن میں انہوں نے اپنی شاعری کا مقام و مقصد بیان کیا ہے موجود ہوں گے۔ ایک دو متفرق اشعار پیش کرتا ہوں تاکہ اقبال اور سرمد کا رابطہ مجسم ہو سکے۔

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست
بُت تراشی بُت گری مقصود نیست
شعر را مقصود گر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

ایں میاں کیہ است نقدِ سخن!
بر عیارِ زندگی او را بزن!

سرمد نے مندرجہ بالا اشعار میں شاعروں کو تلقین کی ہے کہ وہ اپنے کلام سے اقوام کی راہنمائی کریں۔ علامہ مرحوم کی تعلیمات میں کئی جگہ الارض للہ کی تفسیر ہے مثلاً

حق زمین را جز متاعِ ما نگفت!
ایں متاعِ بے بہا صفت است و مفت

بندۂ مومن امین حق مالک است
غیر حق ہر شئے کہ بینی ہالک است
ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو!
چیست شرح آیۂ لاتفسدوا!
زیر گردوں فقر دمسکینی چراست
آنچہ از مولاست میگوئی زماست

اسی طرح مثنویات میں اسلام کے متعدد بنیادی مسائل کا بیان ہے۔
سرمد پر اقبال کے مذہبی رجحانات کا گہرا اثر ہے۔ ایک قصیدے میں کہتا ہے ؎

سخن سرائی اقبال بدر دیں افشاند
برغم دشمن بے دین و کافر قتال
رسول دار بہ تبلیغ حق کتاب نوشت
کہ قدر حق بشناسد منافق محتال!

اور دوسری جگہ اقبال کا یوں ذکر ہے ؎

اقبال کہ پیغمبر، پیغمبر حق بود!
در حضرت حق صاحب انعام بزرگ است
اقبال بزرگ است کہ در عالم توحید
از بت شکنی دشمنِ اصنام بزرگ است

اور پیام و کلامِ اقبالؔ کا کتنا دلآویز تجزیہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؏

اقبال زآں ردیف سخن گستراں نبود
کافسانہا ز خسرو شیریں دہن کنند
اقبال بت شکست و خداجائی بت نشاند
زاں سلیمیں ستائش آں بت شکن کنند

ایک اور جگہ سرمدؔ نے کہا ہے کہ شاعر شعر گو بھی ہوتا ہے اور ملہم من اللہ بھی۔ اور اقبالؔ میں یہ دونوں مقام اور ہر دو کیفیتیں جمع ہیں وہ شاعر بھی ہے اور ملہم بھی۔

یہاں مختصراً ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ جب شاہنشاہِ ایران بڑے بڑے زمینداروں سے زمین حاصل کر کے دہقانوں میں تقسیم کر رہے تھے تو سرمدؔ نے اقبالؔ کی پیروی کرتے ہوئے شدت سے اعلیٰحضرت کے اس اقدام کی حمایت کی۔ تھوڑی سی زبان اور طرزِ بیان میں تفاوت ہے ورنہ عالمِ معنی میں سرمدؔ اقبالؔ کا ہم آہنگ ہے۔

خسرو ایران نہ بخود وہ بدہقان میدہد
حکم شہ بر حکم یزداں است غیزایں ناروا ست
و لاجرم شہ زمین بدہقان داد
دیں حقیقت بحکم قرآن است

سرمدؔ نے اقبالؔ کی پیروی میں مولانا جلال الدین رومی کی تجلیل و تکریم

مثنوی اور دیوانِ شمس کے طرز میں کی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر سرمد ناگہانی موت کا شکار نہ ہو جاتا تو مثنوی اقبالؔ کے رنگ میں مولانا روم کا تتبع کرتا۔ اس کی مثنوی میں بلا کی روانی اور رقتِ احساس مشہود ہے۔ نمونے کے طور پر ملاحظہ ہو ؎

ای جلال الدین دڈ نیا مولوی!
ای کلامت ہمچو فرقان معنوی
ای کتابت بر ما اُم الکتاب
وی خطابت بہر ما فصل الخطاب
چوں بنائی عشق خوش سودا شدی
زاں طبیبِ جملہ علّت ہا شدی

یہ اشعار اقبالؔ کے متعدد اشعار کی یاد دلاتے ہیں جس میں اس نے رومی کی تجلیل و تکریم کرتے ہوئے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ایران معاصر کے اہلِ دل حلقوں میں رومی کی مقبولیت کو دوبارہ زندہ کرنے میں اقبالؔ کا کلام و پیام بہت مؤثر ثابت ہوا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ایک دل انگیز مثال احمد سروش کی ہے۔ آئینہ حقیقت۔ ریڈیو تہران کی نشریات۔ وہ اقبالؔ کو علامہ کی بجائے مولانا کہنا کتنا زیادہ مناسب سمجھتا ہے۔

اقبالؔ کے کلام کی ایران میں تاثیر کے صرف ایک دو نمونے اور وہ بھی مختصرًا پیش کئے ہیں۔ اقبالؔ کی نوا، نوائی عشق ہے اور اس نوا سے ایران کے اہلِ دل

شعراء اور ادباء گہرے طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ میں عمداً "اہلِ دل" کی اصطلاح استعمال کر رہا ہوں۔ کیونکہ اقبال اور رومی ایسے شاعر کی آواز کو صرف اہلِ دل ہی سُن سکتے ہیں۔ ان کا کلام و پیام دل ہی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی منزل بھی دل ہی ہے۔ آخر میں بطور خلاصہ ایک دل اور علم دوست اور اہل دل شاعر کے چند اشعار پر اس گفتار کو ختم کرتا ہوں۔ ان اشعار میں شاعر نے اقبال کو ایران کے تین عظیم المرتبت شاعروں کا مظہر قرار دیا ہے۔

اُستاد کاظم رجوی فرماتے ہیں ؎

شاعراں را باید از اندیشہ او پیروی
تا بیار آید ز اقوالش ہمہ افعال او
مولوی و سعدی و حافظ تجلّی کردہ اند
در ہمہ افکار و در اعمال و در امیال او
شرقیاں را باید از شاعر چو پاکستاں سپاس
تا ہمہ راہی بہ پیمانید بر منوال او

یہ تو تھا اقبال کے کلام و پیام کی تاثیر کا ایک مختصر سا خاکہ اہلِ ایران کے دلوں میں۔ یہ بھی غالباً صحیح ہے کہ ایرانیوں کی زبان فارسی ہے اور وہ اقبال کے عالی ترین کلام سے مستفید ہوئے ہیں۔ لیکن اقبال کا برِّ صغیر کے مسلمانوں میں پیدا ہونا محض اتفاقی امر نہیں۔ یہ مشیتِ ایزدی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ ہماری ہزار سالہ

تہذیب و تمدن و ادبیات مٹنے سے بچ جائیں۔ ہمارا شاندار علمی و ادبی ماضی ہمیشہ کے لئے زندہ رہے۔ اور ہماری اس پر افتخار معنوی تاریخ سے ربط کا ذریعہ فارسی زبان ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ جس قوم کی ادبی تاریخ نے اقبال ایسے فخرِ روزگار کو جنم دیا۔ وہ قوم نہ صرف اقبال بلکہ اپنی تمام ہزار سالہ تاریخ سے کٹ جائے۔ ہماری آنکھیں اس کے دیدار سے محروم ہو جائیں اور ہم اس کے لازوال ادبی، علمی اور دینی کارنامے صرف دوسروں کی زبان سے اور وہ بھی ترجمے کے وسیلے سے معلوم کر سکیں۔ ذرا غور و تفکر کی ضرورت ہے اس رابطہ کو قائم رکھنا ہرگز مشکل نہیں۔ فارسی ہماری تہذیب و تمدن کی روحِ رواں اور ہماری قومی زبان کی قوتِ بیان کا سرچشمہ ہے۔ فقط ارادے کی ضرورت ہے۔

حبیب اللہ آموزگار سابق وزیر فرہنگ و مؤلفِ فرہنگ آموزگار۔

یہ فیضِ عرفانی جو ایک طویل مدت کے انتظار کے بعد مجھے نصیب ہوا محمد اقبال کی پاک اور درخشاں رُوح کا اثر ہے جس نے اس برِ صغیر کی خاک سے طلوع ہو کر ایرانیوں کے دل و دماغ پر روشنی ڈالی۔ اقبال کے کلام پر جو اس نے فارسی میں شیریں زبان میں کہا ہے۔ دنیا بھر کے فارسی زبانداں کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ گلچین معانی کی ایک رباعی جو اقبال کے تتبع میں کہی گئی ہے پیش ہے:۔

تاچند ز خویشتن جدائی کردن!
در کار وجود دست رائی کردن!
ز اقبال شنو که گفت خود را بشناس
کز راہ خودی توان خدائی کردن

ڈاکٹر وحید قریشی

علامہ اقبالؔ اور مطالعۂ تاریخ

اقبال فلسفۂ تاریخ کے سلسلہ میں مغربی حکماء سے الگ نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ تاریخ کی حیاتیاتی تعبیر سے چل کر افکار کے تصادم اور طبقات کے تصادم تک جتنے بھی فلسفۂ تاریخ کے نظریات ہمارے سامنے آئے ہیں ان میں سے ایک بنیادی رجحان یہ دکھائی دیتا ہے کہ صرف COLLECTVE IMPERSONAL یعنی اجتماعی غیر ذات ہی ایک حقیقت ہے اور افراد کا الگ وجود محض طلسم کا حکم رکھتا ہے۔ سائنسی معلومات نے سوسائٹی کو ایک عالمِ نمودار، فرد کو ایک خلیہ ثابت کیا۔ اس سے یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے کہ کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟ آیا وہ افکار و خیالات کے مقابلے میں ایک تنکے کی حیثیت رکھتا ہے یا نظامِ کائنات میں اسے کچھ اختیار بھی حاصل ہے؟ یہ صورتِ حال ہمیں جبر و اختیار کے مسائل سے دوچار کرتی

ہے۔ دوسری طرف کائنات کی اہمیت ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ آیا اس کائنات کی تہہ میں کچھ بندھے ٹکے اصول کارفرما ہیں یا نہیں؟ یہ مرحلہ ہمیں تاریخ کے بنیادی مسائل سے دوچار کر دیتا ہے۔ کیا انسان محض شر ہے یا محض خیر؟ کیا واقعات کے سامنے وہ بے دست و پا ہے؟ کیا زمان و مکان کی نظم و ترتیب کسی ضابطے کے مطابق چل رہی ہے؟ فلسفۂ تاریخ انہیں مسائل کے گرد گھومتا ہے۔ مغربی مفکرین خصوصاً شنگلر کی رائے میں انسانی زندگی کے تمام مظاہر مختلف اوقات میں زمان میں سے متعین ہوتے ہیں۔ اور انسانی جدوجہد اس عمل کا محض ایک نتیجہ ہے۔ گویا اس طرح انسان کی ہستی کائنات میں کوئی نتیجہ خیز تبدیلی نہیں کر پاتی۔ اقبالؔ اپنے نقطۂ نظر کو قرآن کی تعلیمات کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ وہ فرد کو اتنا حقیر، بے حقیقت اور واقعات کے سامنے بے دست و پا نہیں گردانتے وہ اسے نیابتِ الٰہی کا حقدار قرار دیتے ہیں اور اسی نقطے سے ان کا نظریۂ خودی، تقویت پاتا ہے۔ اور یہیں سے فلسفۂ تاریخ کے بارے میں ان کا نظریہ واضح ہوتا ہے۔

اقبالؔ مغربی مفکرین کے اس خیال کے مؤید نہیں ہیں کہ انسان واقعات کے ریلے میں بالکل بے دست و پا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے اور تخلیق کائنات کا مقصد ہونے کو بنیاد تسلیم کرتے ہیں اور یہی دیدی کا انتخاب ان کی رائے میں فرد کا ذاتی فعل ہے۔ نیٹشے کے خیال میں حالات و واقعات کی ترتیب مقرر شدہ ہے۔ اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اقبالؔ کو اس سے بھی اختلاف

ہے۔ اُن کی رائے میں واقعات صرف اپنا اعادہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کی رائے میں ETERNAL RECURENCE ازلی تکاتر کا یہ قانون اسلام کی رُوح کے منافی ہے۔ واقعات تاریخی تسلسل کے ساتھ محض اپنا اعادہ نہیں کرتے۔ ان میں ترمیم اور اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ اقبال کے اس عقیدے کا ایک رشتہ ان کے تصورِ زمان و مکان سے وابستہ ہے۔ ان مسائل کے حل کے لئے وہ فلسفۂ تاریخ کو فلسفۂ تمدن کے پس منظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ دوسری طرف اس عقیدے کا رشتہ جبر و اختیار کے مسئلے سے بھی ہے۔ جو مسلمان حکماء کے نزدیک اکثر ادواری اور اہم رہا ہے۔ تیسری طرف ارتقائے انسانی میں خودی کی تربیت کے لئے بھی وہ اسی تصور کو رہنما بناتے ہیں۔ زندگی اُن کے ہاں مسلسل حرکت، متواتر جدوجہد اور حصولِ مقصد کے لئے ان تھک تگ و دو کا نام ہے۔ اس لگن کے بغیر زندگی کو وہ موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اعلیٰ مقصد (نیابتِ الٰہی) کی خاطر جدوجہد ان کی نظر میں لازمۂ شرفِ انسانی ہے۔ اس کے حصول میں کام آنے والے عناصر کو وہ لبیک کہتے ہیں۔ اور ان کے خلاف جانے والے عناصر (نفی خودی کے عناصر) کو رد کرنے کے قائل ہیں۔ دراصل انسان پیدائشی طور پر نیک ہے۔ حالات و واقعات اس میں بدی پیدا کرتے ہیں اور ان بُرے اثراتِ اور اچھے رجحانات میں امتیاز خود انسان کے اختیار میں ہے۔ ایسے ہی انسان مجبورِ محض نہیں رہتا۔ وہ صاحبِ اختیار ہو جاتا ہے۔ اور واقعات کے دھارے پر بھی اس کا اقتدار تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اقبال کے فلسفیانہ افکار کا یہ پہلو کائنات کے

بنیادی حقائق کے علاوہ تاریخ کی افادیت کو بھی تسلیم کرتا ہے۔

زندگی ایک مسلسل رو ہے۔ مسجد قرطبہ اور ساقی نامہ میں زندگی کے اس تسلسل کی طرف کئی اشارے کئے ہیں۔ نیز یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اقبال کے نزدیک تاریخ واقعات کے اعادے کا نام نہیں ہے۔ اس میں نت نئے اضافے نت نئے افکار شامل ہوتے رہتے ہیں۔ گویا زندگی کا تسلسل روز و شب کے امتیاز سے بلند ہے۔ زندگی اسی طرح کی اکائی ہے تو پھر ماضی کا حال کے ساتھ اور حال کا مستقبل کے ساتھ گہرا رشتہ ہو گا۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں گذشتہ کا شعور بھی عطا کرتا ہے اور آئندہ کے لئے بصیرت بھی دیتا ہے۔ ہمارا ماضی ہمارے حال سے وابستہ ہے۔ انسان صاحبِ اختیار ہے اس لئے قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا شخص زندگی کی موجِ رواں سے زوال آمیز اثرات کو خارج کر کے اس میں نیا خونِ زندگی دوڑانے کا اہل ہو سکتا ہے اور وہ صحت مند عناصر کی مدد سے ماضی کے آئینہ میں فردا کی جھلک دیکھ سکتا ہے۔ ماضی کا یہ مطالعہ اسے زندگی کے بہتے ہوئے دریا میں انسانی افعال و اوضاع کو سمجھنے کا شعور عطا کرتا ہے۔ تاریخ کا طالب علم اس شعور کی مدد سے خود اعتمادی کا درس لیتا ہے اور تیقن اعتماد کے ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیتا ہے۔

اقبال کی رائے میں قوموں کا عروج و زوال بنیادی اقدار سے گہری وابستگی اور عدم وابستگی سے پیدا ہوتا ہے۔ قومیں اس وقت زوال پذیر ہو جاتی ہیں۔

جب وہ اپنے مقصودِ حیات سے کنارہ کش ہو جاتی ہیں ؏

زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن

زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن!

مرگِ فرد از خشکیٔ رودِ حیات

مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

اس ملّی شعور کی پرداخت کی خاطر اور زوال سے بچنے کے لئے اقبال تاریخ کے مطالعے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اُن کی رائے میں تمام علوم کی بنیاد نہج فرد کی تکمیل خودی اور معاشرے کی اصلاح و ترقی ہے۔ وہ نفی خودی کے عناصر کے خلاف ہیں اور تاریخ، فلسفے، علومِ اسلامی، تصوّف، فقہ، تفسیر وغیرہ میں اسی نقطۂ نظر کو جاری رکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ وہ تاریخ کے مطالعے میں زندگی کی نشوونما اور فرد کی حفظ و بقا کا خیال رکھتے ہیں۔ اعلیٰ انسانی مقاصد کے حصول کے لئے دیگر علوم کی طرح وہ تاریخ کو بھی ایک خاص ڈھانچے میں ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ مختلف ممالک کی تاریخ میں وہ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کو تلاش کرتے ہیں اور فرد کو، معاشرے کے پسِ منظر میں معیاری معاشرے کا ایک خاص ڈھانچہ ان کے ذہن میں ہے۔ تاریخ کا مطالعہ وہ اسی کے حوالے سے کرتے ہیں۔ مختلف تحریکات کے مطالعے میں وہ فرد کو بھی مناسب اہمیت دیتے ہیں اور تاریخی عوامل پر فرد

جس حد تک اثر انداز ہو سکتا ہے اس کی تلاش و جستجو بھی کرتے ہیں۔ فرد اُن کے نزدیک حالات کا غلام نہیں۔ وہ حالات کو بدلنے کی قوت بھی رکھتا ہے۔ اس خیال کے زیرِ اثر جہاں جہاں انہیں انسانی خودی کی تکمیل کے مظاہر دکھائی دیئے ہیں ان کا ذکر انھوں نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر، سلطان ٹیپو، ابوذر غفاری، فاطمۃ الزہرہ حضرت علیؓ کی ذاتِ بابرکات اس تاریخی مطالعے میں بہت اہم ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا رومؒ، جمال الدین افغانی اور بعض دوسرے اکابر کے کارناموں کو بھی انہوں نے بغور دیکھا ہے۔ ان کے ہاں تاریخ محض بادشاہوں کے حالات یا محض واقعات کا روزنامچہ نہیں ہے۔ وہ عمرانی مسائل، اقتصادی عوامل، اخلاقی اقدار، فنونِ لطیفہ سبھی کو اس تاریخی مطالعے کا ضروری حصہ گردانتے ہیں۔ ان کے ہاں تاریخ ایک فکری اور روحانی تسلسل کا نام ہے۔ یہ محض انسانی ذہن کو جلا دینے ہی کا کام نہیں کرتی۔ انسان میں اعتماد اور ایقان کے اوصاف بھی پیدا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اخلاقی خوبیوں کو راسخ کرنے کے لئے وہ تاریخ کے مطالعے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسری اقوام کی تاریخ خصوصاً یورپ کی تاریخ، اخلاق اکثر ان کے پیشِ نظر رہی ہے۔ اروپائی سیاست اور نسلی امتیازات کی تہہ میں انہیں اخلاقی اور روحانی اقدار کی شکست و ریخت دکھائی دی۔ یورپ کی اس مادی ترقی کو (جو اخلاقی اور روحانی اقدار سے خالی ہے) اقبالؔ انسانی ترقی کی معراج تسلیم نہیں کرتے۔

ان کے ہاں روحانی اقدار کے بغیر ترقی بہیمانہ عناصر کی حامل ہوتی ہے۔ وہ لینن کی خودی کو مانتے ہیں لیکن اس خودی پر انہیں یہ اعتراض ہے کہ وہ خودئ، مسلمان نہیں۔

گویا تاریخ کا مطالعہ اقبال کے نزدیک محض افراد یا تحریکات کے الگ الگ مطالعے کا نام نہیں۔ فرد اور معاشرے کا ارتباط اور اس کی تہہ میں مضمر اصولوں کی جستجو و تلاش اس کی اصل اساس ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

اقبال کے عمرانی تصوّرات

اقبالؔ کے افکار کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمارے پاس تین بڑے ماخذ ہیں۔

۱۔ اقبالؔ کے خطبات ۲۔ اقبالؔ کے خطوط ۳۔ اقبالؔ کا کلام (یعنی اُن کی اُردو اور فارسی شاعری)

اگر اقبالؔ محض شاعر ہوتے تو پھر شاید ایک حد تک یہ ممکن ہوتا کہ ان کے کلام کی نمائی اور فکری ترتیب کا لحاظ رکھے بغیر کوئی شخص ان کے کلام سے اپنے مطلب کی چند باتیں نکال لیتا اور انہیں سیاق و سباق سے جدا کر کے اقبال کے پردے میں اپنے خیالات کا پرچار شروع کر دیتا جیسا کہ بعض حضرات نے کچھ حصہ پہلے بھی کیا اور اب پھر کر رہے ہیں۔ یا جیسا کچھ نقادوں کو فکرِ اقبالؔ کے بعض گوشوں میں تناقص یا تضاد نظر آتا ہے اور یہ اس لئے ہے کہ ہمارے یہ نقاد

حضرات اقبال کے فکری و شعری ارتقا کو عصر اقبال کے سیاسی اور عمرانی پسِ منظر سے الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ اس لئے انہیں ترانۂ ہندی والے اقبال اور ترانۂ ملی والے اقبال میں تضاد نظر آتا ہے۔ اقبال اپنے زمانے کی بعض تحریکات (مثلاً اشتراکی انقلاب) اور بعض اہم شخصیات یعنی (مسولینی) کا ذکر اگر کسی جگہ اچھے الفاظ میں کر دیتے ہیں تو کبھی انہیں اشتراکیت کا موئید سمجھ لیا جاتا ہے اور کبھی انہیں فاشیت کا حامی قرار دیا جاتا ہے اور پھر شاہین اور کبوتر وغیرہ استعاروں سے اس طرزِ استدلال کو اور مستحکم بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مولوی اور صوفی کو ہر بات میں گالی دینے والا خوش پوش طبقہ اقبال کے بعض شعروں سے اپنے مطلب کی بات نکال کر اقبال اور مُلّا کی آویزش کو ایک حقیقت بنانے کی کوشش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حضرات، طرزِ استدلال کی یہ ملمع سازی اس صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے جب اقبال بھی اور شاعروں کی طرح صرف شاعر ہوتے۔ اور جس وقت جو محسوس کرتے اُسے جامۂ شعر پہنا کر خود فارغ ہو جاتے۔ اس کے برعکس اقبال ایک مستقل فکر و نظر کے نمائندے ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں، باقاعدہ ایک تسلسل اور ترتیب ہے۔ اور اُن کے افکار کے سلسلے اپنے ہی بنیادی عقیدے اور مطمعِ نظر پر قائم رہتے ہیں۔ گو وہ ایک حقیقت پسند شاعر کی حیثیت سے دوسرے رجحانات کو بالکل نظر انداز نہیں کر جاتے وہ ان کا بھی تجزیہ کرتے ہیں۔

اور ان کی عصری و عمرانی اہمیت کا اعتراف بھی کرتے ہیں لیکن وہ ان سے مغلوب یا مرعوب نہیں ہوجاتے۔ بلکہ اپنے ہی شجرِ ملی سے پیوستہ رہ کر امید بہار کا پیام سُناتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ اقبالؔ کے بعض خیالات شاعرانہ اسلوب کی وجہ سے ایک عام قاری کے لئے کبھی کبھی الجھن کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔ اسی لئے ہم نے شروع میں عرض کیا کہ اقبالؔ کے بنیادی تصوّرات کا مطالعہ کرنے کے لئے شاعری کے علاوہ ان کے خطوط اور خطبات بھی اہم ماخذ ہیں۔ اگرچہ مؤثر ذریعۂ اظہار شاعری ہے کیونکہ اقبالؔ کے خطبات اپنے وسیع تر فلسفیانہ مباحث کی وجہ سے زیادہ عام فہم نہیں ہیں۔ البتہ خطوطِ اقبالؔ کی زبان نسبتاً آسان اور باتیں عام فہم ہیں بہر کیف اقبالؔ کے ان تینوں ماخذوں کو سامنے رکھ کر ان کے بنیادی افکار کا بخوبی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ابتدائی دور کے اضطرابی و ہیجانی دور کے بعد (جو ۱۹۰۵ تک رہا) اقبالؔ کے ہاں ایک ٹھہراؤ آگیا۔ اُن کی ذہنی و فکری پختگی کے لئے یورپ کا زمانۂ قیام (۱۹۰۵ تا ۱۹۰۸) خاص اہمیت رکھتا ہے۔ غالباً اس کی اہم وجوہ دو ہیں۔

۱۔ یورپی تہذیب اور قومیت کا قریبی مشاہدہ۔

۲۔ اتحادِ اسلامی تحریک جس کے نمائندے سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ کو رحلت فرمائے ابھی چند ہی برس ہوئے تھے اور بلادِ اسلامی اپنی گوناگوں اندرونی

بیماریوں کے باوصف اس تحریک سے خاصے متاثر تھے۔

حصولِ تعلیم کے بعد اقبالؔ جب یورپ سے واپس آئے۔ تو ان کا نقطۂ نظر خاصا پختہ ہو چکا تھا۔ تاہم داخلی اضطراب اور فکری کشمکش ان کے قلب و ذہن میں ابھی موجزن تھی۔ تاآنکہ چند برس بعد اس نے اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کی صورت میں ایک مربوط فلسفۂ حیات کی شکل اختیار کی۔ اس سے پہلے طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے زمانے میں شکوہ اور جوابِ شکوہ اور شمع و شاعر وغیرہ نظمیں لکھ کر وہ اپنے افکار کی چند جھلکیاں دکھا چکے تھے۔

فکرِ اقبالؔ کے سلسلے میں شاعری سے قطع نظر اقبالؔ کا وہ خطبہ نہایت اہم ہے جو انہوں نے ۱۹۱۰ء کے اواخر میں علی گڑھ کالج میں دیا۔ اصل خطبہ انگریزی میں تھا جو اب نایاب ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے اس کا جو اردو ترجمہ کیا تھا۔ اس کا عنوان ہے "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر"۔

اقبالؔ نے اپنے اس خطبے میں عصرِ رواں میں ملتِ اسلامیہ کی معاشرتی، اخلاقی، تعلیمی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے مستقبل کے امکانات پر روشنی ڈالی ہے۔ جب ہم اس خطبے کے پسِ منظر میں اُن کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُن کے بنیادی عقائد و تصورات میں کوئی ابہام نہیں رہتا۔ اسی طرح اُن کے بعد کے خطبات اور کلام انہی تصورات کی وضاحت کرتے اور تعمیرِ ملّی کے بنیادی اصولوں کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔

بحیثیتِ مجموعی اقبالؔ کے فکر و شعر نے بتدریج چند منزلیں طے کی ہیں۔ وطنیت، اسلامیت اور بین الاقوامیت کہ جس کی اساس دین و مذہب پر قائم ہے۔ ان تینوں منزلوں میں گہرا ربط و تسلسل ہے۔ ان میں کوئی آویزش کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ ایک ذرا سے اختلاف سے قطع نظر، جو حب الوطنی کے فطری تصور اور وطنیت کے سیاسی تصوّر کی وجہ سے شروع میں پیدا ہوا۔ اور جس کی وضاحت بھی اقبالؔ نے خود کر دی ہے۔ اُن کے تصورات میں تضاد یا تناقص کی صورت تلاش کرنا عبث ہے۔

مغرب و مشرق کی مفاہمت عالمِ انسانی کی بقا کے لئے اس دور کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ دُنیا کا کوئی خطہ یا ملک بھی اس مسئلے کو پسِ پشت ڈال کر صرف اپنی سلامتی اور ترقی کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ اس کا مشترکہ حل نہ دیا بدیر اقوامِ عالم کو تلاش کرنا ہی پڑے گا۔ اقبالؔ نے اس سلسلے میں دونوں کی بیماریوں پر نظر ڈالی ہے۔

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات
خودی کی موت ہے یہ اور وہ ضمیر کی موت
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آ گئی شاید جہانِ پیر کی موت

اقبالؔ نے ایک حقیقت پسند مفکّر اور انسان دوست شاعر کی

حیثیت سے مشرق اور مغرب کی قوموں کو ان کی خامیوں اور کوتاہیوں سے آگاہ کیا ہے۔ کیونکہ زمانہ اب مقامیت کا نہیں بلکہ بین الاقوامیت کا ہے۔ اور مشرق و مغرب کو اگر سلامتی سے کرۂ ارض پر زندہ رہنا ہے تو وہ زندگی کی بہترین قدروں کو اپنا کر اور ایک دوسرے کو دوستی و عزت کا مقام دے کر ہی زندہ و سلامت رہ سکتے ہیں۔ اقبال کے بین الاقوامی زاویۂ نظر کا پسِ منظر یہی ہے۔

اسلام اور عالمِ اسلامی سے اقبال کے ذہنی و قلبی لگاؤ کی بھی چند ٹھوس وجوہ ہیں۔ انھوں نے بلادِ اسلامی کی پسماندگی بھی دیکھی۔ اور اس پسماندگی میں ذہنی و فکری تحریکوں کو ابھرتے ہوئے بھی دیکھا۔ اتحادِ اسلامی کی تحریک سے وہ بہت متأثر ہوئے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ انھوں نے اسلام کی ان درخشندہ روایات اور فطری تعلیمات کو پیشِ نظر رکھا۔ جو دورِ حاضر کی مادی اور روحانی کشمکش کو ختم کر کے امن و سلامتی اور میانہ روی کا راستہ دکھاتی ہیں۔ اسلام نہ دین کو دنیا پر قربان کرتا ہے اور نہ دنیا کو دین پر۔ بلکہ تن اور من کے درمیان ایک ایسا خوشگوار رشتہ قائم کرتا ہے کہ دین اور دنیا مذہب اور سائنس کی فرسودہ آویزش ختم ہو جاتی ہے۔ اسلام نہ رہبانیت اور ترکِ دنیا کی تلقین کرتا ہے اور نہ یہ سراسر دنیا کے جھمیلوں میں اُلجھ کر انسانی روح کی تشنگی کا باعث بنتا ہے۔ یہ دنیا بھر کے

علوم کی تحصیل، کائنات کے مشاہدے اور تسخیر کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ تن کے راحت وآرام کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی مَن کی پروَرش کی تلقین بھی کرتا ہے۔ تاکہ راہِ حق کا سالک کہیں مقامات میں کھو کر رہ نہ جائے اور علم کا متلاشی کہیں بندۂ حرص وہوس نہ بن جائے۔ علاوہ بریں اسلام عالمگیر انسانی برادری کی تشکیل کے لئے محبت، رواداری، اخوت اور مساوات کی تلقین کرتا ہے۔ خواجہ وبندہ اور آقا وغلام کی تمیز کو ختم کرتا ہے۔ عرب اور عجم، رومی اور حبشی، قوی اور ناتواں کے فطری امتیازات کو تسلیم کرتے ہوئے انسانوں کے دلوں سے احساسِ امتیاز کو مٹاتا اور تقویٰ اور نیکی کو سرداری اور بڑائی کی اساس بناتا ہے۔

اس طرح مختلف رنگ ونسل اور زبان ولباس پر مشتمل انسانی گروہوں کو اسلام ذہنی یکجہتی کا سبق دیتا اور عالمگیر معاشرے کے قیام کا راستہ دکھاتا ہے۔ معاشی سطح پر اسلام زمین اور زمین کی پیداوار، کائنات اور کائنات کی ہر شئے کا مالک خالقِ حقیقی کی ذات کو قرار دیتا اور بندوں کو اس کا امین ٹھہراتا ہے۔ نوعِ بشر کو ہر قسم کی غلامی وتحکومی سے نجات دلاکر اسے ایک ایسی چوکھٹ پر سر جھکانے کی تلقین کرتا ہے۔ جو سب کے لئے قابلِ قبول بھی ہے اور کسی کو اس سے اختلاف بھی نہیں ہو سکتا۔ اقبالؔ 'پیامِ مشرق' کے دیباچے میں فرماتے ہیں:-

'حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح

اندازہ ہم محض اس لئے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں ایک بہت بڑے رُوحانی اور تمدّنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدّن کی خاکستر سے فطرتِ زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔

(دیباچہ پیامِ مشرق، طبع اوّل ۱۹۲۳ء)

اقبالؔ کے نزدیک اسلام ایک ایسا متوازن ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے۔ جو آج کی متحارب دنیا کے لئے زیادہ سے زیادہ قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ نوعِ انسانی کے لئے، جو اس وقت اپنی مادی ترقی اور رُوحانی تشنگی کے باعث بقا اور سلامتی کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ یہ ایک ایسی راہِ نجات ہے، جسے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے دنیا بھر کے دُکھی انسانوں کے لئے پیش کیا ہے۔ اس میں زمان و مکان کی کوئی قید نہیں۔ یہ زندگی کی ازلی و ابدی قدروں کا حامل ہے۔ اس میں اتنی لچک ہے کہ یہ ہر زمانے اور ہر مقام کے لئے دستورِ حیات بن سکتا ہے۔ اس میں دین اور سیاست، مذہب اور سائنس، خرد اور نظر غرض یہ کہ زندگی کی مادی اور رُوحانی قدروں کے سب سلسلے مل جاتے ہیں۔ اور اس ہم آغوشی کے بعد حیات و کائنات کی تسخیر کا ایک ایسا متوازن دستورِ عمل پیش کرتے ہیں جس کی آج دُنیا کو شدید ضرورت ہے۔ آج

کی بھٹکی ہوئی دُنیا اور داخلی طور پر مضطرب انسان اس روشنی میں اپنی منزل کو بہ سہولت پا سکتا ہے۔ اور خدا، انسان اور کائنات کے الجھے ہوئے مسائل بھی بہ آسانی حل ہو سکتے ہیں۔

اسلام سے ذہنی و قلبی لگاؤ کا بنیادی سبب اقبال کا یہی نظریۂ حیات ہے۔ اس نظریۂ حیات میں اقبال عالمِ انسانی کی بقاؤ سلامتی کا راز پا لیتے ہیں اور پھر اس راز کو دُنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں۔ گویا اسلامیت سے یہ لگاؤ بین الاقوامیت ہی کا ایک زینہ اور عالمگیر معاشرے کے قیام کا ایک ذریعہ ہے۔ اقبال کے عمرانی تصوّرات کا یہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد اُن کے خطبات، خطوط اور شاعری کے سلسلے گردش کرتے ہیں۔ اقبال کے اس مرکزی نقطے کی وضاحت کے لئے ہم یہاں اُن کی ایک مختصر سی نظم بعنوانِ 'دین و سیاست' پیش کرتے ہیں۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سُلطانی و راہبی میں
کہ وہ سربلندی ہے یہ سَربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری

ہوئی دین و دولت میں جس دم جُدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری!
دوئی ملک و دیں کے لئے نامُرادی
دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری!
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

ڈاکٹر سید محمد اکرم

پیامِ مشرق پر ایک نظر

پیامِ مشرق جو تقریباً تمام انواعِ شاعری مثلاً رباعی قطعہ مسلط ترکیب بند
مستزاد اور قصیدہ پر مشتمل ہے اور انسجام لفظی اور ابتکارِ معنوی کے اعتبار سے
ایک جامع اور کامل تصنیف ہے ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی۔ یعنی اس دور میں جب
مغربی طاقتیں مشرق کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھیں اور عواطفِ انسانی کو قطعاً
فراموش کر کے مشرقی اقوام کا نہایت بے دریغی سے خون بہا رہی تھیں۔ اور
اسلامی مشرق کو بالخصوص انہوں نے اپنی غارتگری کا نشانہ بنایا ہوا تھا۔ یہ وہ
زمانہ ہے جب سارا مشرق ایک عجیب آشفتگی، بدحالی اور پریشانی کا شکار
ہو رہا تھا۔ سیاسی اور اجتماعی زوال کے ساتھ ساتھ مغربی مادیت کی گھٹاؤں
کے اثر سے مشرق کے پُرنور اُفق پر اندھیرے ہی اندھیرے چھا رہے تھے اور

انسان ان اندھیروں کی آڑ میں بڑی بیدردی سے انسانی ناموس کا پردہ چاک کر رہا تھا۔

مشرق کی بیداری کے لئے اقبال خودی یا استحکامِ ذات کے فلسفے کو پیش کر کے اہلِ مشرق کو انسان کی لامحدود اور غیر فانی معنوی اقدار کا درس دے چکا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اقبال نے اجتماعی قدروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مغرب کو مادہ پرستی کے برعکس مذہب اور رُوحانیت کی تعلیم دینی شروع کی اور اس میدان میں وہ مشرق کا زبردست معنوی مبلّغ بن کر اٹھا اور اسی معنویت کے درس کو انسانی رفاہ و فلاح کا واحد ذریعہ قرار دیا۔

پیامِ مشرق اقبال نے جرمنی کے بلند پایہ اور شہرۂ آفاق شاعر گوئٹے کے دیوان غربی و شرقی' کے جواب میں لکھی۔ گوئٹے نے اپنا یہ دیوان کچھ ایسے ہی آشفتہ اور پُراضطراب حالات میں لکھا تھا۔ دراصل انقلابِ فرانس کے بعد یورپ کچھ اس طرح بیدار ہوا کہ مادیت کے سوا اسے دُنیا میں کوئی اور قدر دکھائی نہ دی اور وہ مادی ترقی کی رو میں بہہ کر معنویت اور وجدان سے جو انسان کا بہترین سرمایہ ہے بہت ہی دُور جا پڑا۔ چنانچہ یورپ کی یہ فضا ایک حساس رُوح اور ایک معنوی شخص کے لئے ناقابلِ زیست بن گئی۔ گوئٹے جیسے انسان دوست آدمی کے لئے ایسی مکدّر اور مسموم فضا میں دم لینا دشوار تھا۔ چنانچہ وہ یورپ کے غیر فطری اور غیر انسانی ماحول سے فرار کر کے مشرق کی روشن اور پُر رُوح

وادیوں میں پناہ لینے کے لئے مجبور ہو گیا۔ اس حقیقت کی تائید میں ہائنا کہتا ہے۔

"دیوانِ غربی سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے"

مشرق کی جانب عزیمت کے سلسلے میں ۱۸۱۴ء میں گوئٹے نے اپنے مجموعہ کلام کو شعرائے مشرق کی روایت کے مطابق 'دیوان' کا نام دیا اور ہجرت کے عنوان سے اس کا سرِ آغاز لکھا جو مختصراً یوں ہے۔

'شمال، مغرب اور جنوب پریشان اور آشفتہ ہیں۔ تخت و تاج برباد ہو رہے ہیں اور سلطنتوں کے پائے لرز رہے ہیں۔ تو اس دوزخ سے دُور بھاگ جا۔ اور دل انگیز مشرق کا رُخ کر تاکہ وہاں روحانیت کی ٹھنڈی ہوا تجھ پر چلے اور محفلِ عشق و شراب اور آبِ حیات تجھے زندہ کرے۔

'آ کہ میں بھی اسی راہ کا مسافر ہوں تاکہ مشرق کی پاک فضاؤں میں گم ہو کر صدیوں پیچھے چلا جاؤں۔ یہاں تک کہ ایک ایسے زمانے میں پہنچ جاؤں جس میں لوگ خدا سے آسمانی قوانین کو زمینی لفظوں کے وسیلے سے سیکھا کرتے تھے۔ آ کہ میں بھی دیارِ مغرب کا مُسافر ہوں تاکہ وہاں گڈریوں کے ساتھ ایک پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی بسر کروں۔

(پیامِ مشرق دیباچہ ص ل)

'اے حافظ! اس سفرِ دُور دراز میں اور ان وادیوں کے نشیب و فراز میں ہر جگہ تیرے آسمانی نغمے تیرے ہم سفر ہیں اور میرے دل کے لئے موجبِ تسکین۔ اے حافظِ مقدس! میری آرزو

یہ ہے کہ میں سفر اور حضر میں ہر جگہ تیرے ساتھ رہوں۔ (۱)

ثانیاً یہ نقطہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ مشرق اور مغرب میں جو خلیج حائل ہو رہی تھی اور جس طریق سے انسان کو انسان سے جُدا کیا جا رہا تھا وہ گوئٹے جیسے وسیع مشرب انسان کے لئے قابلِ تحمل نہ تھا، لہٰذا اس نے احترامِ آدمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے انسان کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کی زبردست مہم شروع کی، چنانچہ دیوان غربی و شرقی، ایک عظیم انسانی فلسفے کا سنگِ بنیاد ہے جس کے ذریعے عالمِ انسانی کے اتحاد کی جامع اور بلیغ کوشش کی گئی ہے۔ فی الحقیقت گوئٹے کا زمانہ قومی تعصب اور نیشنلزم کے آغاز کا زمانہ تھا جس کے خلاف گوئٹے کی آفاقی اور ہمہ گیر طبیعت نے زبردست آواز بلند کی۔ اس نے قومیت کے پست تصور کو پسِ پشت ڈالا اور انسانیت کی طرفداری اور انسانی برادری کو اپنا شعار بنایا۔ وہ اس بارے میں دسمبر ۱۹۱۴ء میں لکھتا ہے۔

'میں چاہتا ہوں کہ اس دیوان کو ایک آئینۂ عالم یا جامِ جہاں نما کی صورت دوں اور اس میں مشرق اور مغرب کو ایک دوسرے کے قریب لا کر دکھاؤں۔ (۲)

مئی ۱۸۱۵ء میں لکھتا ہے۔

'میری آرزو اور مقصد یہ ہے کہ میں مشرق کو مغرب، ماضی کو حال اور ایرانی کو

---

(۱) دیوانِ شرقی — تہران ۱۳۲۸ — ص ۳۸، ۳۹

(۲) دیوانِ شرقی — ص ۲۵

جرمن کے نزدیک کردوں اور ان مناطق کے لوگوں کے طرزِ فکر، عادات اور رسوم کو ایک دوسرے سے آشنا کراؤں۔ (۱) مشرق اور مغرب اللہ کے ہیں اور شمال و جنوب بھی۔

گوئٹے نے اس عظیم مقصد کے لئے ایک عالمی ادب کا سہارا لیا۔ اس سلسلے میں وہ اگرچہ گوناگوں اقوام کے تمدن، طرزِ فکر اور مذہبی اختلافات سے دوچار ہوا لیکن بایں ہمہ اس نے اپنے دیوان میں اس بنیادی نکتہ پر یہ زور دیا کہ:-

"مشرق اور مغرب ایک دوسرے سے جدا نہیں اور نہیں ہر صورت ایک دوسرے کے قریب ہونا چاہیئے۔ (۲)

گوئٹے اس عالمی ادب کو وجود میں لانے کے لئے یورپی ادب کے تین بڑے دھاروں یعنی فرانسیسی، جرمن اور انگریزی ادب کے علاوہ ہسپانوی، اطالوی اور قرونِ وسطیٰ کے ادب کو بھی لازمی قرار دیتا تھا۔ اس نے ہمیشہ اس امر کی تاکید کی کہ:-

بابِ ادب کو مکمل طور پر کھولنا چاہیئے تاکہ مشرق کے عظیم الشان شعراء یعنی حافظ اور سعدی بھی اس بزم میں شریک ہو سکیں۔ (۳)

---

(۱) دیوانِ شرقی ص ۲۶

(۲) دیوانِ شرقی ص ۲۷

(۳) دیوانِ شرقی ص ۲۷

وہ اہلِ علم و دانش کو اس بات کی تلقین کرتا رہا کہ انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو قومیت کی چار دیواری میں محبوس نہ کریں بلکہ آفاقی بلندیوں پر نظر رکھتے ہوئے تمام بنی نوعِ انسانی کا احترام کریں۔

تیسری بات جو "دیوانِ شرقی دمغربی" میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ وہ اجتماعی اور مذہبی تعصبات سے گوئٹے کی شدید نفرت ہے۔ گوئٹے نے اپنے دیوان میں حافظ کی طرح کوشش کی ہے کہ وہ خشک تعصبات کی بجائے وجدان اور منطق کو اپنا شیوہ اور شعار بنائے۔ چنانچہ اس وجدانی رجحان اور منطقی غلبہ کی بنا پر کہتا ہے: "اگر معنیٔ اسلام اپنے امور اور ارادوں کو خدا کے سپرد کرنے کا نام ہے تو ہم سب مسلمان ہیں اور مسلمان ہی مریں گے:" (۱)

ایک دفعہ گوئٹے کی معشوقہ ماریانِ ولمر (MARIANNE WILLMER) نے جسے وہ زُلیخا کے نام سے پکارا کرتا تھا گلے میں صلیب پہن رکھی تھی، گوئٹے دیکھ کر سخت برہم ہوا اور کہنے لگا کیا حافظ شیرازی تجھے اس بدنما ہار کے ساتھ اپنے شیراز میں داخل ہونے کی اجازت اور تجھے اپنے حضور میں جگہ دے گا؟ جا، خدا کے شرک کی اس علامت کو دُور پھینک دے۔ (۲)

اپنی نظم "ساقی نامہ" میں قرآنِ پاک کے متعلق لکھتا ہے: "بعض لوگ قرآنِ کو قدیم اور

---

(۱) دیوانِ شرقی — ص ۲۸

(۲) دیوانِ شرقی — ص ۹۸، ۹۹

بعض حادث تصور کرتے ہیں۔ مجھے اس راز کا علم نہیں اور نہ ہی میں اسے جاننا چاہتا ہوں کیونکہ میرا تو یہی ایمان ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور مُسلمان کے لئے بس اتنا ہی جاننا کافی ہے۔

گوئٹے نے پیغمبر علیہ السلام کی تعریف میں جابجا نظمیں کہی ہیں اور اس طریق سے کوشش کی ہے کہ شرق و غرب کے مذہبی تعصبات کو ختم کرے اور اہلِ مغرب پر دینِ اسلام کی ہمہ گیری کو واضح کرے۔

اس نے نپولین کے ساتھ ملاقات میں اپنی نظم 'محمدؐ' پر تبصرہ کرتے ہوئے دینِ اسلام کی آفاقیت اور اس کے نشر و شیوع کو بے حد سراہا۔ نپولین نے بھی جو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مداح تھا اور آپؐ کو 'فاتح عظیم' کہا کرتا تھا والٹیئر پر سخت نکتہ چینی کی کیونکہ موخر الذکر نے 'المیہ محمدؐ' لکھ کر حضرت نبی اکرمؐ کی شان میں گستاخی کی تھی۔

گوئٹے نے 'نغمہ محمدؐ' 'برگزیدہ اشخاص'، 'ہجرت کا نواں سال' اور دیگر بہت سے آثار میں پیغمبرِ اسلامؐ کی تعریف و توصیف بیان کی ہے۔ 'برگزیدہ اشخاص' میں وہ اپنے آپ کو جنگِ بدر کے شہداء میں شمار کرتا ہے۔

اقبالؔ گوئٹے کے ان پاکیزہ رجحانات سے بہت متاثر ہوا، خصوصاً اس لحاظ سے بھی اقبالؔ کو گوئٹے پسند آیا کہ جن انفرادی اور اجتماعی کیفیات کا اقبالؔ تجربہ کر رہا تھا، تقریباً اسی نقطۂ نظر سے گوئٹے نے ایک سو

سال پیشتر انہیں بڑے وضوح کے ساتھ بیان کیا تھا۔ پیامِ مشرق میں اس حقیقت کا اعتراف اقبال نے یوں کیا ہے۔

ہر دو دانائی ضمیرِ کائنات
ہر دو پیغامِ حیات اندر ممات
ہر دو خنجر، صبح خند، آئینہ فام
او بر ہنہ، من ہنوز اندر نیام
او ز شوخی در تہ قلزم تپید
تا گریبانِ صدف را بر درید
من بآغوشِ صدف تابم ہنوز
در ضمیرِ بحر نایابم ہنوز (۱)

'پیامِ مشرق' میں بعض نظمیں ملتی ہیں جو گوئٹے کے دیوانِ شرقی کی نظموں کا آزاد ترجمہ ہیں۔ مثلاً 'حور و شاعر' جس میں علامہ اقبال نے زندگی کی لامتناہی فعالیتوں کو بیان کیا ہے اور انسان کے فلسفۂ ارتقا پر بڑی کامیابی سے بحث کی ہے۔ اسی طرح 'جوئے آب' گوئٹے کی نظم 'نغمۂ محمدؐ' کا آزاد ترجمہ ہے۔ جس میں اسلامی تخیل اور فلسفۂ اجتہاد کو نہایت خوبی سے

---

(۱) پیامِ مشرق ص ۳

بیان کیا گیا ہے اور یہ کہ دینِ اسلام نے کس طرح پُرانی رسوم و قیود کو توڑا۔ مال و دولت اور رنگ و نسب کے امتیازات کو نابُود کیا اور بندہ و آقا تی کی تمیز کو کالعدم قرار دے کر انسانیت کو مساوات کے حقیقی اصولوں سے روشناس کرایا، مزید یہ کہ اسلام میں کسی جمودِ فکری کی گنجائش نہیں بلکہ وہ زندگی کے نت نئے تقاضے سے روبرو رہتا ہے اور انہیں تمام و کمال پورا کرتا ہے اور اس طرح یہ سماوی دھارا اپنی منزل یعنی خدا کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔

دریائے پرخروش زبند و شکن گذشت
از تنگنائے وادی و کوہ و دمن گذشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را!
از کاخ شاہ و بارہ و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بے قرار
در ہر زمان بتازہ رسید از کہن گذشت
زبحرِ بیکرانہ چہ مستانہ میرود
درخود یگانہ از ہمہ بیگانہ میرود (۱)

---

(۱) پیامِ مشرق ص ۱۵۲

چونکہ گوئٹے کلامِ حافظ سے غیر معمولی طور پر متأثر تھا اور اپنے آپ کو نہایت فخر کے ساتھ اس کا مُرید سمجھتا اور حافظ کے کلام کو ابدیت کی طرح عظیم اور جاودانی خیال کرتا تھا۔ لہٰذا اقبال نے اس رعایت سے 'پیامِ مشرق' میں غزلوں کا ایک بڑا حصّہ ایسا تصنیف کیا ہے جو زبان و بیان کے اعتبار سے بہت حد تک غزلیاتِ حافظ کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ اس حصّے کا نام بھی اقبال نے حافظ ہی کے ایک شعر(۱) سے اخذ کیا ہے۔ یعنی 'می باقی'۔ اس عنوان کے تحت کئی غزلیں ہمیں ایسی ملتی ہیں جن میں حافظ کا استقبال کیا گیا ہے مثلاً حافظ کی اس غزل کے جواب میں :۔

کنون کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود!
بنفشہ در قدمِ او نہاد سر بسجود (۲)

اقبال کہتا ہے :۔

بہار تا بہ گلستاں کشید بزمِ سرود
نوائے بلبلِ شوریدہ چشمِ غنچہ گشود! (۳)

---

(۱) بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت ۔ کنار آب رکنا یا دو گلگشتِ مصلّیٰ را

(۲) دیوانِ حافظ، چاپ امیر کبیر تہران ۱۳۳۷ ص ۱۶۳

(۳) پیامِ مشرق ص ۱۶۷

حافظ:-

باصبا در چمنِ لالہ سحر میگفتم

کہ شہیدان کہ اندایں ہمہ خونین کفنان (۱)

اقبال قافیہ کی تبدیلی کے ساتھ:-

در چمنِ قافلۂ لالہ و گل رخت کشود!

از کجا آمدہ اندایں ہمہ خونیں جگراں (۲)

حافظ کی اس غزل کے استقبال میں:-

سرم خوش است و ببانگ بلند میگویم

کہ من نسیمِ حیات از پیالہ می جویم (۳)

اقبال کہتا ہے:-

بایں بہانہ دریں بزمِ محرمے جویم

غزل سرائم و پیغام و آشنا گویم (۴)

حافظ کی اس غزل کی پیروی میں:-

اگرچہ عرضِ ہنر پیشِ یار بی ادبی است

زباں خموش ولیکن دہان پر از عربی است (۵)

---

(۱) دیوانِ حافظ ص ۲۷۵ (۲) پیامِ مشرق ص ۱۶۹

(۳) دیوانِ حافظ ص ۲۷۰ (۴) پیامِ مشرق ص ۱۷۳

(۵) دیوانِ حافظ ص ۶۰

اقبالؔ کہتا ہے:۔

بشاخِ زندگی مانمی زتشنہ لبی است
تلاش چشمۂ حیواں دلیل کم طلبی است (۱)

حافظ:۔ نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند (۲)

اقبالؔ:۔ جہانِ عشق نہ میری نہ سروری داند
ہمیں بس است کہ آئین چاکری داند (۳)

حافظ:۔ روشن از پرتو رویت نظری نیست کہ نیست
منت خاک درت بر بصری نیست کہ نیست (۴)

اقبالؔ تغیرِ قافیہ کے ساتھ:۔

سرخوش از بادۂ تو خم شکنی نیست کہ نیست
مست لعلین تو شیریں سخنی نیست کہ نیست (۵)

---

(۱) پیامِ مشرق ص ۱۹۶ (۲) دیوان حافظ ص ۱۳۴
(۳) پیامِ مشرق ص ۲۱۰ (۴) دیوان حافظ ص ۶۶
(۵) پیامِ مشرق ص ۲۱۷

حافظ :-

جز آستان توام در جہاں پناہی نیست
سرِ مرا بجز ایں در حوالہ گاہی نیست ! (۱)

اقبال :-

اگرچہ زیب سرش افسر و کلاہے نیست
گدائے کوئے تو کمتر ز پادشاہے نیست (۲)

اور یہ مشہور شعر مزید تائید کرتا ہے :-

تنم گلے ز خیابانِ جنتِ کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است (۳)

اسی حصے میں اقبال اہلِ نظر کے حق میں گوئٹے کے فیوض کا اعتراف کرتا ہوا کہتا ہے :-

صبا بہ گلشنِ ویمر سلام ما برساں
کہ چشمِ نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت (۴)

'می باقی' کے بعد پیامِ مشرق میں ایک حصہ 'نقشِ فرنگ' کے نام سے

---

(۱) دیوانِ حافظ ص ۶۸ (۲) پیامِ مشرق ص ۲۱۸
(۳) پیامِ مشرق ص ۲۱۴ (۴) پیامِ مشرق ص ۱۸۴

درج ہے۔ یہاں اقبال نے گوئٹے کی طرح مغرب کی ناقص تہذیب کو ہیچ قرار دیتے ہوئے اسے مشرق کی طرف سے پیغام بھیجا ہے کہ وہ عقل کی بجائے عشق کی طرف رجوع کرے کیونکہ یہی وہ جذبہ ہے جو ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے اور یہی وہ افلاطون اور جالینوس ہے جو انسان کے معنوی امراض کا درماں کر سکتا ہے کیونکہ عقل کے ہاتھوں انسان اور بھی بیمار ہو گیا ہے۔

از من اے بادِ صبا گوئے بدانائے فرنگ
عقل تا بالِ کشود است گرفتار تر است
عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری
عجب ایں است کہ بیمار تو بیمار تر است
دانش اندوختۂ دل ز کف انداختۂ
آہ زاں نقد گرانمایہ کہ در باختۂ (۱)

'جلال و گوئٹے'، 'پیغامِ برگساں'، 'میخانۂ فرنگ'، 'حکمتِ فرنگ'، 'جلال و ہیگل'، 'شعراء'، 'حکمت و شعر' اور 'الملک للہ' بھی اسی انداز کی نظمیں ہیں جن کے تجزیہ و تحلیل کے لئے مفصل بحثیں درکار ہیں۔ ان منظومات

---

(۱) پیامِ مشرق ص ۲۲۶

اور دیگر اکثر اشعار میں علامہ اقبال نے یہ جامع کوشش کی ہے کہ وہ مغرب کو مشرق کی ان روحانی اقدار سے آشنا کرائے جو مشرق و مغرب کے آفاق سے بالاتر انسانی مقام کا تعین کرتی ہیں اور جن کی رو سے ساری مخلوق خدا کا کنبہ قرار پاتی ہے۔

اور اگر مغربی اقوام ان بنیادی قدروں سے روگرداں ہو کر محض مادیت کو اپنا قبلہ بناتی ہیں اور بنی نوع انسان کی عزت و ناموس کو برباد کرتی ہیں تو یہ ترقی، یہ علم و فن اور یہ سائنس اور اس کے یہ حیرت انگیز انکشافات بے سود اور بے معنی ہیں۔ 'طیارہ' کے عنوان سے علامہ نے ایک نظم لکھی ہے کہ ایک پرندہ دوسرے پرندوں سے کہہ رہا تھا کہ انسان کو خدا نے پرواز کے لئے بال و پر عطا نہیں کئے۔ میں نے کہا پھر کیا ہوا، ہم نے طیارہ سے اپنے لئے بہتر بال و پر بنا لئے ہیں اور اس کے ذریعے ہم آسمانوں پر پرواز کرتے ہیں۔ یہ طیارہ جبریل کی طرح قوی بھی ہے اور سریع السیر بھی۔ میرا جواب سن کر اس پرندے نے بجھے دوستانہ نظر سے دیکھا اور کہا یہ سب صحیح ہے مگر یہ تو بتا کہ تم نے زمین کے کام سب ٹھیک کر لئے ہیں کہ آسمانوں کی طرف اڑنا شروع کر دیا ہے۔

مگر اے نگاہ تو بر چون و چند!
اسیر طلسم توپست و بلند
تو کارِ زمیں را نکو ساختی؟

کہ با آسماں نیز پرداختی؟ (۱)

طیارہ تو انسان نے بنا لیا مگر اس لئے نہیں کہ اس سے اہلِ زمین پر گُل افشانی کرے بلکہ اس لئے کہ اس کے ذریعہ انسانوں پر آگ برسائے۔ درحقیقت انسان کی بقاء اور ترقی کا راز انسانیت کے احترام میں ہے اور بس۔ اگر انسان فی الواقع چاہتا ہے کہ وہ زمین پر عزّت و ناموس کے ساتھ زندہ رہے اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور استعدادوں سے استفادہ کرے اور انسانی تہذیب و تمدّن کو فروغ بخشے تو ضروری ہے کہ وہ رنگ و نسب کے ناپاک تصوّرات اور قومیت و وطنیت کے ذلیل عقائد کو اپنے ذہن سے یکسر ترک کر دے اور انسانی اخوت، محبت اور مساوات کو اپنا شعار اور نصب العین بنائے۔ اور الخلق عیال اللہ کے پیشِ نظر شرقی یا غربی ہونے پر ناز نہ کرے۔ وللہ المشرق والمغرب۔

چارہ اینست کہ از عشق کشادی طلبیم
پیشِ او سجدہ گزاریم و مرادی طلبیم (۲)

---

(۱) پیامِ مشرق ص ۱۶۳

(۲) پیامِ مشرق ص ۲۲۷

پروفیسر کرم حیدری

اقبال کا فلسفۂ تعلیم

برصغیر ہند و پاک میں جتنا کچھ اقبالؔ، اور اس کے کلام اور پیام کے متعلق لکھا گیا ہے شاید ہی آج تک کسی بھی اور فردِ واحد کے متعلق لکھا گیا ہو۔ لیکن اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو جو کچھ اقبالؔ کے متعلق لکھا گیا ہے اُس کی شخصیت اُس کا مقام اور اس کا پیغام اُس سے کہیں زیادہ لکھے جانے کا متقاضی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لکھنے والوں نے محض اوپر اوپر اٹھنے والی لہروں کا مشاہدہ کر کے اپنے اپنے قیاس کے مطابق اُس بحرِ ذخار کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے جو ان اوپری لہروں کے نیچے اپنے دامن میں علم و حکمت کے بے بہا موتی سمیٹے ہوئے ایک ازلی ابدی کشمکش میں مصروف ہے۔ جس طرح معمولی روشنی کی شعاعیں سمندر کی تہہ تک پہنچنے میں ہماری

رہنمائی نہیں کر سکتیں اُسی طرح اقبالؔ کے کلام کی تہہ تک پہنچنے کے لئے محض علمِ ظاہر ہماری معاونت نہیں کر سکتا۔

اقبالؔ کے متعلق لکھنے والوں نے سب سے زیادہ اُس کے فلسفۂ خودی کی توضیح و تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ لوگوں نے زمان و مکان کے متعلق اس کے تصوّرات پر بھی بحث کی ہے۔ لیکن تصورِ زمان و مکان چونکہ خالصتاً علمی اور فلسفیانہ موضوع ہے اس لئے بحث کرنے والوں نے عام طور پر اس میں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اقبالؔ کی عام اصطلاحات مردِ مومن، قلندر، حکیم، کلیم، شاہین اور عقاب پر بھی لوگوں نے بہت کچھ زورِ قلم صرف کیا ہے اور اُس کے فوق البشر کے متعلق بھی طویل بحثیں کی گئی ہیں۔ مگر جس چیز پر سب سے کم توجہ صرف کی گئی وہ اقبالؔ کا فلسفۂ تعلیم ہے۔ آج سے چند سال قبل اقبالؔ کے متعلق ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی ایک فاضلانہ تصنیف 'فکرِ اقبال' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اُن بزرگوں میں سے ایک تھے جنہیں اقبالؔ کے ساتھ بیٹھنے کے مواقع بکثرت نصیب ہوئے۔ اس کے علاوہ اُن کی اپنی افتادِ طبع بھی فلسفیانہ تھی، مزید برآں وہ ہمارے ملک کے ایک بڑے نامور ماہرِ تعلیم بھی تھے۔ توقع تھی کہ اُن کے ہاں اس موضوع پر بہت کچھ ملے گا لیکن انہوں نے بھی اقبالؔ کے نظریۂ تعلیم پر بحث نہیں کی۔ اُسی سال 'نقوشِ اقبال' کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی جو آقائے رازی اور علامہ عرشی کے

مقالات پر مشتمل ہے۔ آغائے رازی گورنمنٹ کالج لاہور میں ادبیاتِ فارسی کے پروفیسر تھے اس لئے تعلیم سے براہِ راست متعلق تھے لیکن یہ کتاب بھی اقبال کے فلسفۂ تعلیم کے متعلق خاموش ہے۔ اقبال کے فکر و فن کے متعلق ایک نہایت عمدہ، گراں بہا اور قابلِ قدر تصنیف 'روحِ اقبال' ہے جو اپنے اعلیٰ معیارِ تنقید کی بنا پر برِّ صغیر کے تمام علمی حلقوں میں بڑی قدر و منزلت حاصل کر چکی ہے لیکن اس کتاب میں بھی اقبال کے نظریۂ تعلیم پر سیر حاصل تبصرہ نہیں کیا گیا۔

اس سلسلے میں ہم اقبال کے ناقدین پر بھی کوئی الزام نہیں دھر سکتے چونکہ اقبال نے خود تعلیم کے متعلق براہِ راست بہت کم کہا ہے اس لئے ہر ناقد کی نظر اُس مخصوص فلسفۂ حیات کی طرف ہی جاتی ہے جس کی تبلیغ انہوں نے زندگی بھر نہایت شد و مد سے کی ہے اور یہ مخصوص فلسفۂ حیات اُن کا فلسفۂ خودی ہے۔

اگر ہم اس امر کو تسلیم بھی کر لیں کہ اقبال ایک فلسفۂ حیات کے داعی تھے اور نظری اختلافات کے لئے تمام تر گنجائش رکھتے ہوئے بھی یہ فلسفۂ حیات جامع اور مکمل ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ تعلیم و تربیت کے متعلق بھی اُن کے خیالات واضح اور مکمل تھے کیونکہ کوئی فلسفۂ حیات بھی تعلیم و تربیت جیسے اہم اور بنیادی پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور ہر چند کہ اقبال نے اپنی

گراں مایہ تصانیف میں فلسفۂ تعلیم کو اس تفصیل سے بیان نہیں کیا جس تفصیل سے کوئی ماہرِ تعلیم بیان کرتا۔ تاہم ہمیں اُن کے کلام میں اس تفصیل کے اجمالی خاکے، جو اپنی جگہ بالکل واضح اور مکمّل ہیں ضرور ملتے ہیں۔ ہمیں ایک فلسفی اور شاعر سے اجمالی خاکوں سے زیادہ کی توقع بھی نہ رکھنی چاہیئے۔ ان خاکوں میں رنگ بھرنا اُن ماہرینِ تعلیم کا کام ہے جو تعلیم و تربیت کے اہم قومی اور ملکی مسئلے کے تمام عملی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں اور جن کا کام اس بنیاد پر ملّت کی آئندہ تعمیرِ نو تشکیل ہے۔

سترھویں صدی کے آغاز میں یورپی اقوام نے اپنے ملکوں سے نکل کر تجارت اور تسخیرِ ممالک کے میدان میں قدم بڑھانے شروع کئے۔ نئی دُنیا کی دریافت اور وہاں کے بے پناہ ذخائرِ دولت کی درآمد نے اُن کے سینے میں نئے نئے ولولے اور نئی نئی امنگیں پیدا کیں۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک یہ اقوام ترقی کی کئی منازل طے کر چکی تھیں۔ سائنسدانوں کی نت نئی ایجادات اور سائنس کی پیش قدمی نے اہلِ یورپ کے ذہنی اُفق میں بڑی وسعت پیدا کر دی تھی۔ انہیں اپنی صلاحیتوں کا احساس ہو چکا تھا یا اقبال کے الفاظ میں اُن کی خودی بیدار ہو چکی تھی۔ اور وہ ان صلاحیتوں کو بطریقِ احسن بروئے کار لا رہے تھے اِدھر ایشیا اور افریقہ میں جہاں بیشتر علاقوں میں مسلمانوں کو عددی تفوّق حاصل تھا۔ اور نیل کے ساحل سے لے کر خاکِ کاشغر تک اور طرابلس الغرب

کے میدانوں سے لے کر ملایا اور انڈونیشیا کے سبزہ زاروں تک تہذیبی
تفوق کے مالک بھی وہی تھے اقبال مندی کا سورج ڈھل رہا تھا۔ مسلمان
اپنی بارہ سو سالہ جدوجہد کی زندگی کے بعد گویا تھک کر سستا رہے تھے۔
تاریخِ انسانی کے سٹیج پر ایک طویل عرصے تک، نمایاں ترین کردار ادا کرتے
رہنے سے اب اُن کے قوائے ذہنی و جسمانی انحطاط پذیر ہو رہے تھے۔ وہ
سیلِ بے پناہ جو کسی زمانے میں تمام بلندیوں اور پستیوں کو روند چکا تھا بلکہ
یوں کہیئے کہ دیارِ مغرب پر عظمت و اقبال کا سورج نصف النہار پر تھا۔
اور ارضِ مشرق پر شام کے دھندلکے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ سرزمینِ
ہند میں جو ایران کے بعد اسلامی تہذیب و تمدن کی سب سے بڑی
جولانگاہ تھی مسلمانوں کی قوتیں منتشر ہو چکی تھیں۔ شمشیر و سنان کا زمانہ
ختم ہو چکا تھا اور طاؤس و رُباب کا دور دورہ تھا۔ طاؤس و رباب
کے نغموں میں بھی وہ ہمہ گیری اور بلند آہنگی مفقود ہوتی چلی جا رہی تھی۔
جو دو صدیاں پہلے مغل دربار کا طُرّۂ امتیاز تھی اور جس کی گونج وسطِ
ایشیا اور مشرقِ قریب سے گذر کر ڈیلیوب کے کناروں بلکہ اٹلانٹک
کے سواحل تک سُنی جاتی تھی۔

ان حالات میں یورپین اقوام اور ہندی مسلمانوں میں تصادم ہوا۔
یہ تصادم دو فوجی قوتوں یا دو حکومتوں کا نہ تھا۔ ایک تہذیب اپنی اٹھان

پر تھی دوسری زندگی کے آخری مراحل طے کر رہی تھی۔ ایک برفانی پہاڑوں سے پھوٹنے والا تند و تیز دریا تھا دوسری طرف تپتے ہوئے میدانوں میں نرم و گرم ریت کی آغوش میں سوئی ہوئی ندی۔ ایک کو اپنے پھیلاؤ کے سامنے شش رانگِ عالم کی وسعتیں تنگ نظر آ رہی تھیں اور ایک پر اپنے گھر کی چار دیواری تنگ ہو رہی تھی۔ اس کشمکش کا نتیجہ وہی ہوا جو تاریخی عوامل اور جدلیاتی فلسفے کے اعتبار سے ہونا چاہیئے تھا۔ مسلمانوں کی قوت و حشمت کی بساط الٹ گئی اور وہ چراغ جسے خواجہ معین الدین اجمیری رح، سیدی ہجویری رح اور خواجہ نظام الدین اولیاء جیسے بزرگوں نے اپنے نفسِ گرم سے روشن کیا تھا اور جسے ایک ہزار سال تک افغانوں، ترکوں اور مغلوں نے اپنے خون سے روشن کئے رکھا تھا۔ لال قلعہ کے مرمریں طاقوں میں گل ہو کر رہ گیا۔ اس کے بجھنے سے مسلمانوں کے دل و دماغ پر یک لخت یاس و اندوہ کی ظلمتیں چھا گئیں۔ آخری دور میں چند کرنوں نے کاویری، ہگلی اور جمنا کے کنارے اُفقِ مغرب سے آنے والی تاریکیوں سے علیحدہ برآمد ہونے کے لئے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن بادِ مخالف کچھ اس شدت سے چل رہی تھی کہ ؏

جس نے سورج کی شعاؤں کو گرفتار کیا

زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

زوال و انحطاط کے اس دور میں مسلمانوں کے اندر دو مکتبہ ہائے فکر کام کرنے لگے۔ ایک مکتبۂ فکر وہ تھا جس کی داغ بیل شاہ ولی اللہ رح دہلوی اور اُن

کے خانوادۂ پاک نے ڈالی تھی۔ دوسرا مکتبۂ فکر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد وجود میں آیا۔ اس کی بنیاد رکھنے والے سید احمد خان تھے۔

شاہ ولی اللہ کا مکتبۂ فکر جدوجہد یعنی زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز کا علمبردار تھا۔ اس فکر کا مرکزی نقطۂ نگاہ جہاد تھا اور جہاد بھی بالسّیف۔ اس مکتبۂ فکر کے پیرو کفر و اسلام میں کسی سمجھوتہ کے قائل نہ تھے۔ وہ راہِ خدا میں سر کٹانا اور گھر لٹانا جانتے تھے۔ دشمنانِ دین سے براہِ راست ٹکرانا اور شکست پر شکست کھا کر بھی ہار نہ ماننا اُن کا مسلک تھا۔ وہ اپنے سر کو جو خدائے وحدہٗ لاشریک کے آستانے پر جھکتا تھا۔ اور کسی دروازے پر جھکانے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ فتح یا موت کے قائل تھے۔ درمیانی راستہ چاہے کتنا ہی دلفریب اور پرکشش ہو انہیں قبول نہ تھا۔

مغلیہ سلطنت کے انحطاط کے ساتھ ہی اس تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس تحریک کے سربراہ ہندی مسلمانوں کے انجام کا اندازہ ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کر چکے تھے۔ چنانچہ ملکی اور غیر ملکی دشمنوں کے ساتھ اُن کے پے در پے تصادم ہوئے اور ۱۸۵۷ء تک احیائے اسلام تک کی یہ عملی تحریک دشمنوں کی ریشہ دوانیوں اور دوستوں کی کج فہمیوں کے باعث کئی زخم کھا چکی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے سانحۂ عظیم کے بعد تو مسلمانانِ ہند کو اپنی ہستی ہی خطرے میں نظر آنے لگی۔ انگریزوں کی نگاہ میں ہر مسلمان سرکش اور باغی تھا۔ اس لئے ان کی سرکوبی لازمی تھی۔ اُس

پرآشوب زمانے میں سیّد احمد خاں ایک عزمِ مجاہدانہ لئے ہوئے آگے بڑھے اور نہ صرف مسلمانوں کی کشتیٔ حیات کو نذرِ طوفان ہونے سے بچا لیا بلکہ ان کے سامنے زندگی کا ایک تیا لائحہ عمل بھی رکھا۔

سر سید احمد خاں کی تحریک حقیقت پسندی پر مبنی تھی وہ جان چکے تھے کہ ہر قوم کے لئے اجل یعنی ایک میعادِ عمل ہے۔ فرمانِ خداوندی کے مطابق اس برِعظیم میں مسلمانوں کی حاکمیت کی زندگی ختم ہو چکی ہے۔ تیا سورج ابھر رہا ہے اس لئے ڈوبتے ہوئے تاروں کا ماتم کرتے رہنے سے یا آنکھیں موند کر نئے سورج کے وجود سے انکار کرتے رہنے سے کچھ نہ بنے گا۔ اس وقت مصلحت یہی ہے کہ اس نئے سورج کی تابانیوں سے استفادہ کیا جائے۔ اپنی کمزوریوں کا محاسبہ کیا جائے اور نئے زمانے کی تابانیوں کو اپنی ذات میں سمو لینے کی جدوجہد کی جائے۔ اس مکتبۂ فکر کی بنیاد سمجھوتے پر تھی۔ مشرق اور مغرب میں سمجھوتہ۔ قدیم اور جدید میں سمجھوتہ۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز کا اصول۔ جو لوگ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر گہری نظر رکھتے تھے جو دماغ کی بجائے دل، معنی کی جگہ لفظ، اور غور و فکر کے بدلے جذبات سے کام لینے کے عادی تھے انھیں سمجھوتہ کی یہ تحریک ایک آنکھ نہ بھائی۔ انہوں نے صرف موافقت نہ کرنے پر بس نہ کی عملی مخالفت بھی کی۔ لیکن سمجھوتہ کی اس تحریک کو کامیاب ہونا تھا سو ہوئی۔ کیونکہ واقعات و حالات کا ظہور تاریخی عوامل کے تابع ہوتا ہے اور جس دور میں

تاریخی عوامل کا جو تقاضا ہوتا ہے حالات اور واقعات اسی نہج پر چل نکلتے ہیں اور وہ شخصیتیں بھی جو ہمیں حالات و واقعات کا رُخ موڑتی ہوئی نظر آتی ہیں درحقیقت انہی تاریخی عوامل کے زیر اثر نشو و نما حاصل کرتی ہیں۔

انیسویں صدی کے اواخر تک مسلمان سمجھوتے کی اس تحریک کی طرف پوری طرح مائل ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے اس نئے دور کے لئے مغربی علوم اور کسی حد تک مغربی طرزِ معاشرت کو بھی اپنا لیا تھا۔ اس کے باوجود یہاں یہ کہنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ دنیائے اسلام میں صرف ہندی مسلمان ہی ایسے تھے، جنہوں نے مغربی علوم کے حصول کے ساتھ ساتھ اپنی ملّیت اور قومی خصوصیات کو برقرار رکھا تھا حالانکہ استیلائے مغرب کی ضوب سے زیادہ انہی پر پڑی تھی۔ اب مسلمان طلبا نہ صرف اندرونِ ملک انگریزی زبان اور جدید مغربی علوم کی تعلیم حاصل کرنے لگ گئے تھے بلکہ سینکڑوں نوجوانوں نے خود انگلستان کی یونیورسٹیوں میں جاکر ان علوم کی تکمیل کی۔ انہی نوجوانوں میں سے بہت سے ایسے نکلے جنہوں نے آگے چل کر ہندوستانی مسلمانوں کے طرزِ فکر و نظر پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ انہی میں سے ایک اقبال بھی تھے جن کا اثر غالباً سب سے گہرا اور سب سے زیادہ رس ہے اور جوں جوں زمانہ گزرتا چلا جائے گا یہ اثر اور زیادہ ہوتا چلا جائے گا۔

بظاہر یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان میں انگریزی

استعمار کے سب سے بڑے حریف اور سب سے بڑے دشمن جنہوں نے اس استعمار کا مقابلہ کیا اور بالآخر اسے ختم کر کے دم لیا وہی لوگ تھے جنہوں نے سرزمین انگلستان میں تعلیم حاصل کی تھی اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ اُس ملک میں بسر کیا تھا۔ لیکن درحقیقت یہ چیز اصول فطرت کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ ہر خلیل کسی آذر کے گھر میں اور ہر موسیٰ کسی فرعون کے ہاں نشو و نما حاصل کرتا ہے جن لوگوں نے انگریزوں کے درمیان رہ کر ان کی زندگی اور معاشرے کا نہایت قریب سے مطالعہ کیا وہی اُس طلسم سے آزاد ہو کر جو سات ہزار میل کی دوری کے باعث عام ہندوستانیوں کی آنکھوں ---- پر نظر فریب پردہ بنا ہوا تھا۔ اُس پر دانش مغرب کی تمام حقیقت واضح ہوئی اور انہیں احساس ہو گیا کہ اپنی تمام ظاہری چمک دمک کے باوجود یہ دانش بنوع بشر کے لئے ایک عذاب سے کم نہیں۔

اقبالؔ اسی بنا پر فرماتے ہیں ؎

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ
مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت، کہاں حجابِ دلیل

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہونے کے بعد اپنے ہم قوم اور ہم وطن لوگوں کو اس عذاب کی ماہیت سے باخبر کرنا اور اس عذاب سے بچانے کی کوشش کرنا اقبال

کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد قرار پا گیا۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کر دیا۔ اُن کی تمام عمر مغربی استعمار کے خلاف لڑتے لڑتے گذر گئی۔ اس استعمار نے انہیں اپنے ارادوں سے باز رکھنے کے لئے طرح طرح کے دام بھی پھیلائے لیکن وہ مُرغ بلند آشیاں جو فطرت سے عالی ہمتی کا جوہر لے کر آیا تھا اس دام میں کہاں آنے والا تھا اُس نے صفیروں کو بھی آگاہ کیا کہ ؎

اے طائرِ لاہوتی، اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مغربی تہذیب و تمدن اور فلسفہ و علوم جن کی تمام تر بنیاد مادیت پر تھی۔ اُن کا بغور مطالعہ کرنے اور اُن کا موازنہ اور مقابلہ مشرقی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے جن کی بنیاد روحانیت پر تھی کرنے کے بعد اقبال نے اقوامِ مشرق کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے لئے بالخصوص ایک عملی فلسفۂ حیات پیش کیا۔ یہ فلسفۂ حیات شاہ ولی اللہ کے مکتبۂ فکر اور سید احمد خان کے مکتبۂ فکر کے بین بین اعتدال کا ایک راستہ تھا اور مختصراً اُس کی خصوصیات یہ تھیں۔

۱۔ مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف بغاوت

۲۔ اہلِ مغرب کی استعماریت کے خلاف عملی جدوجہد

۳۔ علومِ مغربی سے بقدرِ ضرورت و ہمت استفادہ

شاہ ولی اللہؒ کے مکتبۂ فکر کے پیرو مغربیت سے قطعاً نفرت کرتے تھے یہاں تک کہ اُن کے نزدیک انگریزی زبان کا پڑھنا پڑھانا بھی غلط بلکہ ناجائز تھا۔ سرسید سکول کے حامی نہ صرف انگریزی زبان اور یورپی علوم وفنون کے حصول کو اپنی ترقی کے لئے لازمی خیال کرتے تھے بلکہ یورپ کی مادّی ترقی سے مرعوب ہوکر وہ یورپی تہذیب وتمدّن کی برتری کے بھی قائل تھے۔ یہ دونوں راستے اعتدال سے ہٹے ہوئے تھے۔ یورپی علوم وفنون کی حیثیت اپنی جگہ مسلّم تھی لیکن احساسِ کمتری سے اس تہذیب کے سامنے ہتھیار ڈال دینا بھی غلط تھا۔ خدا نے علم وحکمت کو خیرِ کثیر کہا ہے۔ چنانچہ اقبالؔ نے اسی خدائی فرمان کی یاد دلاتے ہوئے مسلمانوں سے کہا ہے ؎

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

اس سلسلہ میں رسولِ اکرمؐ کے ارشادات واضح ہیں۔ جب حکمت کو مومن کی گمشدہ متاع کہتے ہیں اور چین تک بھی جاکر علم حاصل کرنے کی تلقین فرماتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ دنیوی اور سائنسی علوم کو بھی دینی علوم کی طرح ذوق وشوق سے حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جہاں حصولِ علم انسانیت کے بہت بڑے مقاصد میں ایک ہے وہاں یہ مسئلہ نہایت اہم احتیاط طلب بھی ہے۔ علم نُور بھی ہے اور حجاب بھی۔ العلم حجاب الاکبر

ایک بہت بڑی اور ٹھوس حقیقت ہے۔ عام طور پر لوگ خصوصاً ناپختہ نوجوان دوسری اقوام کے علوم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ غیر شعوری طور پر اُن کے وہ اصولِ حیات بھی اپناتے چلے جاتے ہیں۔ جو انہیں احساسِ کمتری میں مبتلا کر کے دوسری اقوام کا صیدِ زبوں بنا دیتے ہیں ؎

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں!
ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں!

صیدِ زبوں بن جانے کی وجہ پیرِ رومی کی زبانی سُنیئے ؎

مُرغِ پرنارستہ چوں پراں شود!
طعمۂ ہر گربۂ دراں شود!

چنانچہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں یہ مُرغانِ پرنارستہ جب مغرب کی علمی فضاؤں میں اُڑتے ہیں تو اکثر و بیشتر گربۂ تہذیب کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اس طرزِ معاشرت، طریقِ گفتار و رفتار، لباس اور چال ڈھال ہی کو قوت و عظمت کی اساس سمجھنے لگتے ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں مشرقی اقوام نے جس تیزی سے مغربی رسوم و عادات کو اپنایا ہے وہ اسی مرعوبیت اور احساسِ کمتری کی دلیل ہے۔ اقبالؔ انہیں آگاہ کرتے ہیں کہ ؎

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رُباب
نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب

نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ رُست
نے ز عریاں ساق و نے از قطع موست
محکمی او را نہ از لا دینی است!!
نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں روغن چراغش روشن است

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی مشرقی اقوام نے اور بد قسمتی سے زیادہ تر مشرق وسطیٰ اور مشرقِ قریب کے مسلمانوں نے چنگ و رُباب، رقص و سرود، ساقِ عریاں اور قطع موہی کو ترقی اور تمدن کی بنیاد سمجھ لیا۔ یہاں تک کہ ترکوں نے اس سات سو سالہ علمی اور ثقافتی روایات سے قطع تعلق کرکے خطِ لاطینی بھی اختیار کر لیا اور علم و فن بالخصوص سائنسی علوم و فنون کی طرف وہ توجہ نہ دی جو اہلِ مغرب کی ترقی کا حقیقی سبب تھی۔ اس شعر میں اقوامِ مشرق کی نقالی اور کورانہ تقلید پر کس قدر بھرپور طنز ہے ؎

حکمت از قطع و بریدِ جامہ نیست
مانعِ علم و ہنر عمامہ نیست

علم و ہنر جہاں قطع و بریدِ جامہ کا پابند نہیں اور عمامہ مانعِ علم و ہنر نہیں ہو سکتا وہاں یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ علم کی دو بڑی شاخیں ہیں

ایک علمِ طاغوتی اور دوسری علم لاہوتی۔ طاغوتی علم وہ ہے جو انسان کو سرکشی اور تمرد سکھاتا ہے اور لاہوتی علم وہ ہے جو اُسے اُس راستے سے بچاتا ہے۔ طاغوتی علم کی بدولت انسان اپنی معمولی سی صلاحیتوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو فرطِ مسرت سے جھوم اٹھتا ہے اور بے اختیار اَنَا وَلَا غَیرِیْ کا نعرہ بلند کرتا ہے اور جس طرح رات کی تاریکی میں کسی ویرانے میں چمکنے والا جگنو یہ سمجھتا ہے کہ فضائے بسیط میں صرف وہی روشنی کا منبع ہے اسی طرح آدمی اس زعم باطل کا اسیر ہو جاتا تمام کائنات میں وہی وہ ہے۔ یہ لادینی خرد جُوں جُوں زیادہ پختہ کار ہوتی جاتی ہے تُوں تُوں دُنیا اور اس میں بسنے والے اپنے ہی ابنائے جنس کی ہلاکت و بربادی کے سامان مہیا کرتے ہیں۔ اور جیسے جیسے بربادی اور ہلاکت کے سامان زیادہ تر ہوتے جاتے ہیں ویسے ہی آدمی انانیت کے نشے میں اور زیادہ مدہوش ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی علم کے متعلق اقبالؔ فرماتے ہیں ؏

علم را بے سوزِ دل خوانی شر است
نورِ اُو تاریکیٔ بحر و بر است
عالمے از غازِ اُو کور و کبود
فرودینش برگ ریزے ہست و بود
بحر و دشت و کوہسار و باغ و راغ
از بمِ طیارۂ اُو داغ داغ!

علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں

یعنی علم ہو لیکن با عشق ہو۔ اس کا پسِ منظر دینی اور بنیاد روحانیت پر ہو۔ اس کا مقصد بنی نوعِ انسان کی خیر و فلاح ہو۔ علم و دانش کو اگر ہم ایک پھول کھلانے والا سدا بہار پودا سمجھیں تو اس پودے کے لئے ذہن کی زمین بھی ایسی ہونی چاہیئے جس میں یہ پودا تر و تازہ رہ سکے اور اس کے ساتھ ہی پھول لگیں جو دماغی اور روحانی کثافتوں کو دُور کر سکیں۔ اگر ہمارے ذہن کی زمین میں ایمان اور ایقان کی بجائے کفر و الحاد کی مٹی ہو گی تو پھول بھی وہ کھلیں گے جو دیکھنے میں تر و تازہ اور خوش رنگ ہوں گے اور اُن میں خوشبوئیں بھی ہوں گی لیکن یہ تر و تازگی اور خوش رنگی ہمیں فریبِ نظر میں مبتلا کر دے گی۔ اور خوشبوؤں کا ایسا زہر ہو گا جو انسانیت کے جوہرِ لطیف کو ماؤف کر دے گا۔

اقبالؔ نے اپنے کلام میں جا بجا مدرسے اور مکتب کو للکارا ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان دانشکدوں سے خواہ مخواہ کی کد ہے بلکہ وجہ صرف یہ ہے کہ ان میں جو علم و ہنر جوانوں کو سکھایا جاتا ہے وہ سوزِ عشق سے خالی ہے۔ اس علم سے دماغ تو منوّر ہو جاتے ہیں لیکن دلوں میں سوز و ساز پیدا نہیں ہوتا۔ یہ علم گویا عصرِ حاضر کی برقی قوت کی طرح ہے کہ اس کی لہر سے انسان کا گھر بھی روشن ہو جاتا ہے لیکن ایک جھٹکے سے وہ ابدی نیند بھی سو جاتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ مدرسہ اور مکتب میں تو

نسل کا گلا گھونٹا جا رہا ہے اور لا الٰہ الا اللہ کی صدا جو مسلمانی کے جسم میں رُوح کا مرتبہ رکھتی ہے اب کہیں سُنائی نہیں دیتی ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نم ناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ

سوز و گداز کی اس بنیادی کمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان علم کے جوہرِ تابناک سے مستفید ہونے کے باوجود اپنے اندر وہ اطمینان محسوس نہیں کرتا جو اسے علم حاصل کرنے کے بعد خود بخود مل جانا چاہیے۔ اطمینان تو درکنار حقیقتاً جتنا وہ علم کے میدان میں آگے بڑھتا ہے اُتنا ہی اُس کے دل کے اضطراب اور روح کی پیاس میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے حکمت کے پیچ و خم اُسے زیادہ اُلجھائے چلے جاتے ہیں۔ وہ راہِ علم کا ایسا مسافر ہوتا ہے جسے اپنی منزل کا کچھ پتہ نہیں اور وہ فِی کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ کے مصداق اطرافِ وجوانب میں بھٹکتا رہتا ہے ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

ایسا علم بجائے اس کے کہ انسان کو کمالِ انسانیت کی طرف لے جائے، اسے گمراہیوں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ مغرب میں اسی علم نے ایسے معاشرے کو جنم دیا جس میں مرد اپنی مردانہ صفات اور عورت اپنے عورت پن سے محروم ہو گئی۔ انسانوں کے دلوں میں محبت کے وہ لطیف جذبات جو مختلف افراد کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھتے ہیں۔ جو مرد اور عورت کو ایک پاک جذبے کے تحت ایک خاندان کی بنیاد رکھنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ یکسر معدوم ہو گئے اور آج مغرب میں اہلی زندگی تقریباً تباہ و برباد ہو چکی ہے۔ کنبہ یا خاندان، جو معاشرے میں ایک مضبوط اکائی کی حیثیت رکھتا ہے تقریباً ختم ہو چکا ہے اور پھر اہلی زندگی کے اس طرح درہم برہم ہونے سے اقوام میں اخلاقی انارکی پھیل گئی ہے۔ اقبال کے نزدیک علمِ مغرب کا دردناک ترین المیہ یہ ہے کہ اُس نے عورت کو جذبۂ امومت سے بیگانہ کر دیا ہے ؎

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

گویا دین انسانی معاشرے کے لئے اہم ترین بنیادی ضرورت ہے۔ یہ سیاست کے ساتھ ملتا ہے تو اُسے چنگیزی سے بدل کر فاروقی بنا دیتا ہے علم کے ساتھ ملتا ہے تو اُسے نار سے نُور اور مار کی جگہ یار بنا دیتا ہے، بہادری اور مردانگی سے ملتا ہے تو مرحبی اور عنتری کو شجاعتِ حیدری سے بدل دیتا ہے۔ دولت کے ساتھ ملتا ہے تو اُسے بخلِ قارونی کے بجائے غنائے عثمانی کا لباس عطا کرتا ہے اور انسانی اخلاق سے ملتا ہے تو اُسے ملکوتیت سے بھی بلند تر لے جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ کسی معاشرے میں معنوی انقلاب دین ہی کے ذریعہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ نظامِ تعلیم ہی وہ عظیم ترین قوت ہے جو معاشرے کے دھارے کا رُخ بدلتی اور اس کی ہیئت کو متشکل اور متصور کرتی ہے اس لئے اس سرچشمۂ قوت میں اعتدال اور توازن کا قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ اعتدال اور توازن دین ہی کے ذریعہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ نظامِ تعلیم کی بنیاد جب تک دینی افکار کے ذریعہ مربوط اور مرصوص نہ کی جائے گی معاشرے کی عمارت کبھی مضبوط اور مستحکم نہیں ہو سکتی۔

صنعتی طور پر اقبال کے فلسفۂ تعلیم میں دوسرے عناصر بھی شامل ہیں ان عناصر میں سخت کوشی، استغنا، قیدِ مقام سے آزادی، خود گری اور خود نگری اہم ترین ہیں۔ سخت کوشی کے متعلق جا بجا اُن کے اشعار ملتے ہیں اور جہاں بھی وہ نوجوانوں کا ذکر کرتے ہیں اُن کے پیشِ نظر وہ نوجوان ہوتے ہیں جو سخت کوش ہوں ؎

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر
نیست از نقد و قماش و مال و زر
مالِ او فرزندہائے تندرست!
تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست

لیکن افسوس کہ وہ اپنی قوم کے نوجوانوں میں انتہائی تن آسانی دیکھتے ہیں اور اس پر جا بجا آنسو بہاتے ہیں ؎

ایں مسلمان زادۂ روشن دماغ
ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ
در جوانی نرم و نازک در حریر
آرزو در سینۂ او دود مید

تن آسانی کا سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ انسان کے دل میں آرزو مر جاتی ہے اور جس کے دل میں آرزو مر جائے وہ کبھی زندہ دل اور باحوصلہ نہیں ہو سکتا۔ تن آسانوں کے لئے زندگی ہمیشہ ایک تلخابہ رہتی ہے اور اس تلخابے کو انگبیں میں بدلنے کا نسخہ محض سخت کوشی ہے ؎

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے جس فلسفۂ خودی کی تبلیغ کی ہے وہ سخت کوشی

ہی کی ایک ارفع صورت کا نام ہے جب تک کوئی شخص سخت کوش نہ ہوگا وہ اپنی خودی کی نگہبانی نہ کر سکے گا۔ اور انفرادی خودی کی حفاظت نہ ہو سکے تو اجتماعی یا قومی خودی کی حفاظت بھی ناممکن ہے ؎

غافل از حفظِ خودی یک دم مشو
ریزۂ الماس شو شبنم مشو
پختہ فطرت صورتِ کہسار باش
حاملِ صد ابرِ دریا بار باش

سخت کوشی اور حفظِ خودی ہی سے قوموں میں قوت اور صلابت پیدا ہوتی ہے۔ دُنیا میں جو ملّت بھی سخت کوش اور اپنی خودی کی نگہبان ہوگی وہی پائیداری اور ثبات حاصل کرے گی اور جو ملّت تن آسان اور آرام پسند ہوگی وہ نیست و نابود ہو جائے گی۔ سخت کوشی ہی سے انسان میں استغنا کا جوہر پیدا ہوتا ہے اور استغنا کا جوہر اُسے سربلند اور ممتاز کرتا ہے اس استغنا کی تعریف اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے ؎

زعلمِ چارہ سازے بے گدازے!
بسے خوشتر نگاہِ پاکبازے!
نکوتر از نگاہِ پاکبازے!!
ولے از ہر دو عالم بے نیازے

شاعری میں اقبال نے شاہین کا جو نیا سمبل تراشا ہے وہ بھی حقیقتاً چند اعلیٰ وارفع صفات کے اظہار کے لیے ہے۔ شاہین جرأت مند اور سخت کوش ہے اُس کی نگاہ ہمیشہ بلندیوں پر رہتی ہے۔ وہ آزاد رو ہے اسیرِ مقام نہیں، پابند خانہ دلانہ نہیں۔ خود دار ہے مردہ شکار پر نہیں جھپٹتا۔ اس کے اندر بے نیازی اور استغنا کی شان پائی جاتی ہے۔ اقبال جب اپنی ملت کے نوجوانوں کو شاہین بچے کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو اس سے اس کی مراد یہی ہوتی ہے کہ ان نوجوانوں میں وہ تمام صفات پیدا ہو جائیں جو شاہینوں میں پائی جاتی ہیں۔ حیوانات میں جتنی صفات ہوتی ہیں وہ عام طور پر جبلّی ہوتی ہیں لیکن انسان انہیں اکتساب کرتا ہے۔ اکتساب صفات کے لیے واضح اور ٹھوس خطوط پر تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ جہاں ممولے تعلیم و تربیت سے شہباز بن سکتے ہیں وہاں شہباز بھی تعلیم و تربیت نہ ہونے سے ممولوں سے ڈرنے لگتے ہیں۔ ایسے ہی غلط طور پر تربیت پائے ہوئے نوجوانوں کے لیے اقبال نے کہا ہے ؎

تنش از سایۂ بال تدروے لرزہ می گیرد

چوں شاہین زادہ اندر قفس با دانہ می سازد

اس تمام گفتگو سے ایک نہایت اہم سوال ذہنوں میں ابھرتا ہے جس کا مختصر جواب دیئے بغیر یہ گفتگو مکمل نہیں ہو سکتی۔ وہ سوال یہ ہے کہ اقبال

کے نظریۂ تعلیم کا منتہا کیا ہے یعنی وہ کس قسم کے انسان کی تخلیق کا آرزومند ہے۔ اس سوال کا نہایت مختصر اور سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ وہ مردِ مومن کا آرزومند ہے جس کی تعریف اُس نے اپنی ایک مشہور نظم میں اس طرح کی ہے ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی بُرہان!
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دُنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم!
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!

یہ اقبال کے مکمل انسان کی تصویر ہے۔ وہ اپنے مکمل انسان میں چار بڑی صفات دیکھنا چاہتا ہے۔ یعنی قہاری، غفاری، قدوسی اور جبروت۔ یہ چاروں صفات صفاتِ الٰہیہ میں سے ہیں۔ گویا ایک مکمل انسان ایک مختصر اور محدود پیمانے پر الوہیانہ صفات کا مظہر ہوتا ہے اُس میں اور خدا میں فرق یہی ہے کہ خدا کی ذات میں یہ صفات لامحدودیت کا جامہ پہنے ہوتی ہیں اور انسان کی ذات میں یہ صفات محدود ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ خدا کی ذات میں اور بہت سی ایسی صفات ہیں جو اُس کی

ذات کے لئے مخصوص ہیں۔ انسان اُن صفات کا اکتساب کرنے سے معذور ہے۔ پھر چونکہ خدا قائم بالذات اور قدیم ہے اس لئے اُس کی ذات میں جو صفات بھی ہیں وہ بھی قدیم اور لازوال ہیں۔ انسان چونکہ حادث ہے اس لئے اُس کی ذات میں اگر چند الوہیانہ صفات پیدا ہوں گی تو وہ بھی حادث اور زوال پذیر ہوں گی۔

یہاں یہ ذکر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دنیا کے اکثر بڑے فلسفیوں نے انسانِ کامل کا خواب دیکھا ہوگا اور اپنی اپنی دانست کے مطابق اُسے مختلف نام دیئے ہیں۔ یورپ کے ایک مشہور مفکر نطشے نے بھی انسانِ کامل کا ایک تصور پیش کیا ہے جسے وہ فوق البشر کے نام سے یاد کرتا ہے۔ بعض نقادوں نے جن میں زیادہ تر مغرب سے تعلق رکھتے ہیں یہ کہا ہے۔ کہ اقبال نے اپنے انسانِ کامل کا تصور نطشے سے مستعار لیا ہے۔ لیکن انھیں یہ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی کہ مشرق کے فلسفیوں کے افکار اُن تک نہیں پہنچے۔ اقبال اور نطشے کے انسانِ کامل میں ایک بنیادی فرق ہے۔ نطشے کے خیال کے مطابق انسانِ کامل کا ظہور جدلیاتی عمل کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ گویا وہ زمان و مکان کی انصرافی قوتیں نقطۂ کمال کو نہ پہنچ جائیں۔ اقبال کا انسانِ کامل زمانی اور مکانی قوتوں کی پیداوار نہیں اور نہ اُس کا ظہور کسی خاص وقت یا بعض حالات کا مرہونِ منت ہے بلکہ زمان و مکان خود اس کے پابند ہیں۔ اُس کا ظہور ہر دور میں ممکن ہے بلکہ کامل ترین انسان کا ظہور تو ہو بھی چکا۔ اب جو کامل انسان آئے گا وہ اُسی کامل ترین انسان کے نقشِ قدم پہ چلے گا۔

نطشے کا فوق البشر مادی طاقتوں اور قوتوں کا مظہر ہوگا۔ اُس کی قوتیں بے پناہ اور لامحدود ہوں گی اُن پر کوئی تحدید نہ ہوگی۔ اقبال کا انسانِ کامل روحانی اور مادی قوتوں کے لطیف امتزاج کا مظہر ہوگا اور روحانی قوتوں کی باگ اس کی مادی قوتوں کو اعتدال اور توازن کے راستے سے نہ ہٹنے دے گا۔ نطشے کا فوق البشر انسانوں کے لئے باعثِ رحمت بھی ہو سکتا ہے اور باعثِ بربادی اور ہلاکت بھی کیونکہ وہ اپنے سے برتر کسی قوت کے سامنے جواب دہ نہیں۔ اقبال کا انسانِ کامل محض رحمت ہی رحمت ہے کیونکہ اُسے ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ وہ اپنے ہر فعل اور ہر عمل کے لئے ایک برتر قوت کے سامنے جواب دہ ہے اور یہ برتر اور بزرگ قوت دانا، بینا اور دلوں کا حال جاننے والی ہے۔

مولانا بشیر احمد اخگر

خطبۂ اختتامیہ

مجھ سے پیشتر محترم ڈاکٹر باقر صاحب نے بڑے لطیف انداز میں کنایتہً
اِن لوگوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے قوم سے غدّاری کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری
قوم کا المیہ آج بھی وہی لوگ ہیں جنہوں نے ہماری تحریک کی مخالفت کی تھی۔
اور اتنے عظیم نقصان کا باعث بنے تھے جس کی تلافی آج تک نہیں ہو سکی اور
شاید خدانخواستہ آئندہ کبھی نہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ ہم سے علّامہ
مرحوم کو علیٰحدہ کر کے عوام کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ علّامہ
کی ذاتِ گرامی سے جو عقیدت قوم کو ہے وہ برقرار رہے کیونکہ یہ عقیدت نتیجتہً
ملّت کے استحکام کا باعث ہوگی۔ اور ملّت کا استحکام انہیں منظور نہیں۔ آج
اعلانیہ اور کھلے طور پر وہ قوم کے خلاف لب کشائی نہیں کر سکتے اس لئے اب

انہوں نے لڑائی کا نیا ڈھنگ اختیار کیا ہے، ہر وہ شخصیت بلکہ ہر وہ چیز جو ملک اور قوم کے لئے ممد و معاون تھی کسی نہ کسی رنگ میں یہ لوگ اس کی تنقیص ضرور کریں گے کیونکہ ؎

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبالؔ کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

اور ایک جگہ علامہ مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہوا گر قوتِ فرعون کی درپردہ مرید!
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللہی!

حضرات ہم اس شیخ الحدیثی اور ابو الکلامی کو کیا کریں گے جس کا سارا زور ملت کی بیخ کنی پر صرف ہو۔ اس جعفریت اور صادقیت کے بت کو جس طرح علامہ مرحوم نے پاش پاش کیا ہے۔ یہ انہی کا حصہ ہے۔

خواتین و حضرات! دوسرا پہلو جو حضرت علامہ کے کلام کا امتیازِ خصوصی ہے وہ ان کا عشقِ رسولؐ ہے۔ سرورِ کائنات کی ذاتِ گرامی سے جو والہانہ عقیدت اس درویشِ سیالکوٹی کو تھی اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ ایک مقام پر اللہ میاں سے مخاطب ہوتے ہیں کہ اے حی لایموت، اے ذوالجلال والاکرام، اے رب السمٰوٰت والارض! تو اتنا اعلیٰ ہے اور میں اتنا ادنیٰ ہوں کہ تیری جیسی عظیم ہستی کے لئے مجھ جیسے گرے پڑے کا حشر کے روز حساب کتاب مانگنا تیری شان کے شایان نہیں تیری عظمت

اور علو کا تقاضہ یہ ہے کہ میری پرسشِ اعمال نہ کر۔ فرماتے ہیں ؎

تو غنی از ہر دو عالم من فقیرا
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر

لیکن اگر میری باز پرس ناگزیر ہو اور حساب کتاب دیئے بغیر چارا نہ ہو تو اے رب العالمین ؎

در تُوے دانی حسابم ناگزیر!
از نگاہِ مصطفٰے پنہاں بگیر

اللہ اللہ کتنا ناز ہے، کتنا پیار ہے سرورِ کونین کی ذات ستودہ صفات پر کہ چونکہ میرا وہ آخری سہارا اور آخری آسرا ہیں اس لئے ان کے سامنے مجھے رسوا نہ کرنا۔

حضرات جہاں تک ادبی اقدار کا تعلق ہے حضرت علامہ کے کلام میں بعض ایسی مثالیں ملتی ہیں جن کی نظیر کم از کم میری نگاہوں میں کہیں اور نہیں گزری۔ موسمِ خزاں میں پھولوں کی پت جھڑ کو کس اچھوتے انداز میں بیان فرماتے ہیں ؎

پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح
دستِ طفلِ خستہ سے رنگین کھلونے جس طرح

ایمان داری کی بات ہے یہ تشبیہ کسی اور جگہ میرے مطالعہ میں نہیں آئی۔

ایک اور مقام پر حرکت و عمل کا نقشہ کچھ اس انداز سے کھینچتے ہیں کہ معنوی حیثیت تو کجا صوتی اور لفظی اعتبار سے بھی ایک عجیب تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

صورت نہ پرستم من، بتخانہ شکستم من
آں سیلِ سبک سیرم ہر بند گسستم من
در دیرِ نیازِ من در کعبہ نمازِ من
زنار بدوشم من تسبیح بدستم من

اور پھر اس شعر پر تو قلم توڑ دیا ہے ؎

سرمایۂ درد تو غارت نتواں کردن
اشکے کہ زدل خیزد در دیدہ شکستم من

آخر میں میں اپنی تقریر کو اس التجا پر ختم کرتا ہوں کہ جو حضرت علامہ نے بارگاہِ رسالت میں حاتم طائی کی بیٹی کی اسیری کے واقعہ کو پیش کر کے کی ہے۔ عزدۂ حنین میں حاتم طائی کی بیٹی قید ہو کر رسول اللہ کے دربار میں پیش ہوتی ہے ؎

در مصافے پیش آں گردوں سریر
دخترِ سردارِ طے آمد اسیر!

حالت یہ تھی کہ ؎

پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود — گردن از شرم و حیا خم کردہ بود

اس بے پردہ انداز میں جونہی وہ خاتون دربارِ رسالت میں آئی حضور نے فوراً کندھے سے اپنی وہ چادر اُتاری جس کے ایک ایک ٹکڑے کے حصول کے لئے جلیل القدر صحابہؓ کی تہجد کی دُعائیں وقف ہو جایا کرتی تھیں اور فرمایا کہ بیٹی کو چادر کا ستر دے کر لایا جائے۔ آگے فرماتے ہیں ع

مازاں خاتونِ طے عریاں تریم

پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم

یا رسول اللہؐ! آج ہم اس خاتونِ طے سے بھی زیادہ بے پردہ ہو چکے ہیں، ہماری چادر اُتر چکی ہے اور دُنیا کے سامنے ہم بے ستر ہو چکے ہیں۔ آج ہمیں اپنے عیوب کی ستر پوشی کے لئے پھر آپ کی ردائے مبارک کی ضرورت ہے حضورؐ۔ اپنی چادر سازی فرمائیے۔ اللہ اللہ کیا مقامِ کیف و سرور ہے!

سلیم ملک

محفلِ مشاعرہ

یومِ اقبال کے سلسلہ میں

رات نو بجے یومِ اقبال کے سلسلہ میں محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی۔ شام ہوتے ہی یوں محسوس ہونے لگا جیسے سارا شہر جاگ اُٹھا ہو بازاروں میں چہل پہل بڑھ گئی۔ اقبال کے شیدائی ۸ بجے رات سے ہی محفلِ مشاعرہ میں شرکت کے لئے آنے لگے۔ چاروں طرف لوگوں کے بے پناہ ہجوم کو دیکھ کر میری نظریں دورآسمان کی وسعتوں میں ٹمٹماتے ہوئے ستاروں میں گم ہو گئیں۔ اور میرے ذہن میں علامہ اقبال کا شعر گونجنے لگا۔ ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اور میں محسوس کرنے لگا کہ اقبال مہِ کامل ہی تو ہے۔ محفلِ مشاعرہ میں جب

میں پہنچا تو وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سٹیج پر مقامی شعراء کے پہلو بہ پہلو احسان دانش، قتیل شفائی، ناصر کاظمی، قیوم نظر، مظفر وارثی، ثاقب زیروی، شرقی بن شائق، عظیم مرتضےٰ، کلیم عثمانی، طفیل ہوشیارپوری، بسمل صابری، منور سلطانہ، محمودہ سوز، رفعت سلطان، خلیق قریشی، حشمت آرا حجاب اور امین گیلانی جلوہ افروز تھے۔ غلام مرتضیٰ پراچہ کو محفلِ مشاعرہ کی مسندِ صدارت پیش کی گئی۔ اور اصغر سودائی سٹیج سکرٹری کے فرائض انجام دینے کے لئے مائک کے سامنے کھڑے ہوئے تو ان کی دعوت پر رفیق ارشد نے مشاعرہ کا آغاز کیا۔ آپ کے بعد اطہر سلیم تشریف لائے۔

اور پھر اسلم عارف نے علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ؎

پیامِ حق کی تفسیریں بنے ہیں
یدِ ملت کی شمشیریں بنے ہیں
تیرے شاہین بچے آ دیکھ اقبال
تیرے خوابوں کی تعبیریں بنے ہیں

اسلم عارف کے بعد ہدایت اللہ اختر کی آمد کا اعلان ہوا اور انہوں نے اقبال اور کشمیر کے عنوان سے نظم میں کہا ؎

تو نے قلندری کا سلیقہ سکھا دیا

انسان کو کیسا نئی عظمت سے ہمکنار
اے غم گسارِ ملّتِ اسلامیہ بتا!
میرے نصیب کا وہ ستارا کہاں گیا

ہدایت اللہ اختر کے بعد فیاض حیدر فیضی غزل سرا ہوئے ؎

دل کی دنیا چُپ اور سادہ حسن کی دُنیا شعلہ رنگیں
کام بنے تو کیسے بنے اور بیل منڈھے یہ کیسے چڑھے
بیس لاکھ بھلاؤں دل سے انھیں وہ لاکھ نہ آئیں دل میں مرے
جو آگ ہو دل میں شعلہ فگن وہ آگ دبے تو کیسے دبے

فیاض حیدر کے بعد اسلم ملک نے علّامہ اقبال کے حضور ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ؎

آج اقبال کا دن ہے جو مر کر بھی امر کہائے
اور اپنی امرت بانی سے وہ کُل دنیا پہ چھا جائے
سیل کی نگری ان کا جنم گھر گلشن گلشن گھومے
قوم کے اونچے نام کی خاطر نیا جہاں کھوجنے آئے
آگ تن من میں ان کے آنسو بنے انگارے
دُنیا کے دُکھ دیکھ کے پگ پگ گیت انوکھے گائے
آج کا نقشہ آج کا منظر اِک شاہکار اسی کا

اندھیاروں میں قدم قدم پر اس نے دیپ جلائے

اسلم ملک کے خراجِ عقیدت کے بعد چونچال صاحب نے اپنے مزاحیہ کلام سے حاظرین کو محظوظ کیا اور پھر امین گیلانی نے دعوتِ سخن ملنے پر کہا ؎

مقفل کر دیا کس نے درمیخانہ برسوں سے
کبھی گونجا نہیں اب نعرۂ مستانہ برسوں سے
خرد مندوں کی زد پر پھر نہ آجائے کہیں دُنیا
سرِ دار اب کوئی آیا نہیں دیوانہ برسوں سے

امین گیلانی گئے تو طفیل ہوشیارپوری غزل سرا ہوئے ؎

وُہ اُٹھی کالی گھٹا! وُہ چلی مست ہوا
ساقیا جام اُٹھا مئے گلفام پلا
روحِ صد نغمۂ مے ایک رنگین سی شئے
تیرے ساغر میں جو ہے وہ ہے درکار پلا
کر نہ انکار پلا

طفیل ہوشیارپوری کے بعد حشمت آرا حجاب نے اقبال کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کیا ؎

سیالکوٹ تیری خاک زرفشاں کو سلام
تیری زمین کو اور تیرے آسماں کو سلام

یہیں سے کفر نے کھائی شکست فاش عجاب

سلام شاعرِ مشرق کے آستاں کو سلام

اب ضمیر فاطمی کو دعوتِ سخن دی گئی۔ وہ کہہ رہے تھے ؎

ہماری خودداریٔ جنوں کو نہ دے سکے گا شکست کوئی

بہار ہو یا خزاں کا عالم چمن کے ہم پاسباں رہیں گے

جبینِ تاریخ پر ابھی تک ہے ثبتِ نقشِ قدم ہمارا

ہمارے باطل شکن ارادے جواں رہیں ہیں جواں رہیں گے

ضمیر فاطمی کے بعد بشیر زیدی اسیر نے شاعرِ مشرق کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ؎

کارگہ عشق کے واقفِ راز و نیاز

دل میں فروزاں تیرا عشقِ سوز و گداز

نغمہ تیرا جس طرف دوشِ ہوا پہ چلا

آگ لگاتا چلا سوزِ دلِ نے نواز

بشیر زیدی کے بعد خلیق قریشی نے اقبال کے حضور ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ؎

شاعرِ مشرق حکیمِ قوم اقبالِ وطن

جس کے نغموں نے کیا تخلیق یہ رنگیں چمن

تیرگی میں شمعِ روشن کی طرح تاباں رہا
کافرستانِ جہاں میں صاحبِ ایماں رہا
اب محمودہ سوز عقیدت کے پھول پیش کر رہی تھیں ؎

اے خودی کے رازداں اے شاعرِ معجز بیاں
آسماں کی وسعتوں میں تیرا شاہیں پُرفشاں
تجھ سے ملّت بن گئی ہے آج اک قومِ عظیم
مان لی ہے اب زمانے نے تیری ضربِ کلیم

محمودہ سوز کے بعد رفعت سُلطان نے اپنے ترنّم سے حاضرین کو محظوظ کرتے ہوئے کہا ؎

خوشی نہیں جو میسّر نہ ہو ملال تو ہو!
کوئی خلش کوئی حسرت کوئی خیال تو ہو
مجھے تو آتشِ دوزخ بھی ہے قبول مگر
میری نظر کے مقابل ترا جمال تو ہو
عجب نہیں کہ تیرا عیب حُسن کہلائے
مگر یہ شرط ہے تو صاحبِ کمال تو ہو
تیرے ستم سے میرا جو بھی حال ہو لیکن
ترے ستم کی زمانے میں اک مثال تو ہو

رفعت کے بعد اب بسمل صابری غزل سرا ہوئیں ؎

کرم فرماؤ پھر سے آپ کوئی
چراغِ درد مدھم ہو رہا ہے
ہوا ترکِ محبت کو زمانہ
خیال ان کا مگر ہم کو رہا ہے

بسمل صابری کے بعد کلیم عثمانی نے اقبال کے حضور خراجِ عقیدت پیش کیا ؎

ساری دنیا سے لیا تیری فراست نے خراج
تو سمجھتا تھا زمانے کی ہواؤں کا مزاج
تیرے الفاظوں کی گرمی سے شرر پیدا ہوئے
تیری گفتار کی شوخی سے گوہر پیدا ہوئے

کلیم عثمانی کے بعد عظیم مرتضیٰ نے غزل پیش کی ؎

لائی نہ صبا بوئے چمن اب کے برس بھی
کچھ سوچ کے خاموش ہیں یارانِ چمن بھی
دستورِ محبت ہی نہیں جاں سے گزرنا
کر لیتے ہیں یہ کام کبھی اہلِ ہوس بھی

عظیم مرتضیٰ کے بعد شرقی بن شائق نے اقبال کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ؎

یہ تیرے نام کی عظمت ہے کوئی کیا جانے
بجھے چراغ پہ بھی گر رہے ہیں پروانے
ترے عظیم خیالات کے فرشتوں نے
اندھیری شب میں لکھے چاندنی کے افسانے

شرقی بن شائق کے بعد اصغر سودائی کہہ رہے تھے ؎

تکمیل بندگی کی ادا ہو گیا ہوں میں
دُنیا سمجھ رہی ہے خدا ہو گیا ہوں میں
ہر ایک دیکھتا ہے مجھے اشتباہ سے
جیسے خلوصِ راہنما ہو گیا ہوں میں
چمکا ہے اس طرح میرا اعجازِ خامشی
ہونٹوں پہ دوسروں کے نوا ہو گیا ہوں میں

اصغر سودائی کے بعد قیوم نظر نے اقبال کے حضور ہدیۂ عقیدت پیش کیا ؎

تیری شاعری نغمۂ شش جہات
خودی کی خدا کی خدائی کی بات
چمک اٹھی ہے اس سے یہ زندگی
اسی سے اندھیرے نے کھائی ہے مات

قیوم نظر کے بعد منور سلطانہ غزل سرا ہوئیں، اور پھر مظفر وارثی نے اقبال کو

خراجِ عقیدت پیش کیا ؎

لوح و قلم شعورِ نظر کا سلام لے
اے شاعرِ عظیم خراجِ کلام لے

مظفر وارثی کے بعد ناصر کاظمی، ثاقب زیروی اور قتیل شفائی نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ ان کے بعد احسان دانش کہہ رہے تھے ؎

کسے خبر تھی کہ یہ دورِ خود غرض اک دِن
جنوں سے قیمتِ دار و رسن چکائے گا
جسے جھنجھوڑ کے رکھ دے صبا کی موجِ خرام
بھلا وہ سازشِ بزمِ چمن چھپائے گا

اسلم ملک

حرفِ مرتّب

علامہ اقبال ایک کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے جدِ اعلیٰ نے ایک سید بزرگ کی شرافت اور پاکیزگی سے متاثر ہو کر ڈھائی سو سال قبل کشمیر میں اسلام قبول کر لیا تھا جن کا اسلامی نام صالح رکھا گیا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے دوران بابا صالح کی اولاد نے وہاں کے ماحول سے تنگ آکر سیالکوٹ میں ہجرت کی۔ اور علامہ اقبال کے دادا محمد رفیق نے سیالکوٹ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کے دو صاحب زادے تھے: ایک کا نام شیخ قادر اور دوسرے کا نام شیخ نور محمد تھا۔ شیخ نور محمد علامہ اقبال کے والد ماجد تھے۔ علامہ اقبال کی والدہ ماجدہ کا نام امام بی بی تھا۔ جو باوجود اس کے کہ لکھ پڑھ نہ سکی تھیں۔ لیکن انھیں اسلامی تعلیمات سے بے حد واقفیت تھی۔

علامہ اقبال ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت سے قبل آپ کے والد شیخ نور محمد نے جو نہایت مرنجان مرنج قسم کے خدا شناس بزرگ اور شفیق باپ تھے خواب دیکھا جس کی تعبیر یہ تھی کہ آپ کے گھر ایک ایسا فرزند جنم لے گا جو اسلام اور مسلمان قوم کی سربلندی کا باعث ہوگا۔ چنانچہ آپ کی والدہ نے اپنے ہونہار بیٹے کی تربیت جس محبت اور سلیقہ سے کی اس کا اظہار علامہ اقبال نے ان کی وفات پر یوں کیا ہے

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر میرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

آپ کا بچپن عام متوسط طبقہ کے بچوں کی طرح کھیل کود میں گزرا۔ آپ کی ذہانت نے ہمیشہ آپ کو اپنے ہم عصروں میں نمایاں رکھا۔ آپ کے والد کو تصوّف میں خوب دسترس تھی۔ اور اس کا اثر آپ پر بھی تھا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم سکاچ مشن سکول میں حاصل کی اور پرائمری، مڈل اور میٹرک میں وظیفہ حاصل کیا۔ میٹرک کے بعد آپ نے مرے کالج میں داخلہ لیا۔ تو آپ کو ایک نہایت شفیق عالم مولانا میر حسن کی شاگردی نصیب ہوئی۔ اقبال ایسے ہونہار شاگرد کی صلاحیتوں کو مولانا نے جس خوبی سے اُجاگر کیا۔ اس کا اعتراف مولانا نے اپنی منظومات میں بطور خاص کیا۔ مولانا کی زیر تربیت کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے شعر و شاعری کی طرف توجہ شروع کر دی۔

انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ لاہور چلے آئے اور گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ گورنمنٹ کالج میں آپ کو پروفیسر آرنلڈ ایسے قابل اُستاد ملے جنہوں نے آپ کی ذہانت اور آپ کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے آپ کی خوبیوں کو اُجاگر کیا۔

لاہور میں ان دنوں شاعروں میں ان کے نام کا خوب چرچا تھا۔ بی۔ اے کے امتحان میں آپ نے پھر وظیفہ لیا۔ اور عربی اور انگریزی میں اوّل رہے اس کے بعد ایم۔ اے کے امتحان میں آپ کو سونے کا تمغہ ملا اور گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے اُستاد مقرر ہوئے۔

۱۸۹۱ء میں آپ نے انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسہ میں اپنی ایک نظم نالۂ یتیم سُنا کر سامعین کو بے چین کر دیا۔ ہمالہ اور ہندوستان ہمارا، دنیا شوالہ اور تصویر درد بھی انہیں دنوں شائع ہوئیں۔

۱۹۰۵ء میں آپ انگلستان روانہ ہو گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ کی ڈگری حاصل کی۔ قیام یورپ میں اقبال کے ذہن میں ایک انقلاب نے جنم لیا۔ یورپ کے حکمرانوں کی تہذیب نے ان کے دل میں مغربی نظام سے نفرت پیدا کر دی۔ اور انہوں نے مشرق کے انحطاط کے اسباب پر غور شروع کر دیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مشرق میں خاص طور پر مسلمان مختلف نظریات کے باعث ایسے ذہنی انحطاط کا شکار ہوئے ہیں جن کا لازمی نتیجہ خودی کی موت ہے۔ چنانچہ یورپ سے واپسی پر آپ نے خودی کا فلسفہ پیش کیا۔ اور اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی میں آپ نے واضح کیا کہ زندگی حرکت کا دوسرا نام ہے اور ہر آدمی میں بے پناہ

صلاحیتیں موجود ہیں۔ ہر آدمی کے ذہن میں نئی آرزوئیں اور نئی تمنائیں ہر لمحہ جنم لیتی رہتی ہیں۔ اور زندگی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر فطرت پر چھا جائیں زندگی کی دشواریوں سے گھبرانے کی بجائے ان کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔

آپ نے ایک ایسے دور کا آغاز کیا جس کی ملک، قوم اور دنیا کو ضرورت تھی۔ آپ اپنی شاعری ہی کے زور پر قوم میں قوت اور حرکت پیدا کرنے کے خواہشمند تھے۔ آپ قوم کو جمود اور انحطاط کے عالم میں دیکھتے اور محسوس کرتے کہ سعی اور اجتہاد کی طاقتیں سلب ہو چکی ہیں۔ آپ نے خوابیدہ قوم کو بیدار کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اور قوم کو ارتقائی منازل سے روشناس کرانے کا عزم کر لیا۔ اور اس کوشش میں منہمک ہو گئے کہ قوم کو ہبوط و تنزل کے رحم و کرم پر نہ چھوڑا جائے۔ اِن کا دل خود فطرتِ انسانی کی عمیق گہرائیوں اور وسیع نکتہ آفرینیوں سے روشناس ہوا اور انہوں نے اس حالت اور کیفیت کو جو اُن کی روح کی گہرائیوں پر مسلط رہی یوں بیان کیا ؎

جہانِ تازہ کی، افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کی عزم و ہمت نے
اس آبِ جُو سے کئے بحر و بیکراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے

جوہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

ہندی اسلام کے عنوان سے آپ نے ایک نظم کہی جس میں حقائق و معارف کی ایک دنیا پنہاں ہے وہ مسلمانوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ وحدتِ افکار ہی سے قوم و ملت کی زندگی ہے۔ اور وحدت کی حفاظت محض عقلِ خداداد ہی سے نہیں ہوتی بلکہ قوتِ بازو سے ہوتی ہے۔ پھر کہتے ہیں اے مسلمان اگر تجھ میں طاقت نہیں ہے تو جا کسی غار میں جا کر عبادتِ الٰہی میں مصروف ہو جا اور وہ اسلام ایجاد کر جس میں محکومی۔ غلامی۔ مسکینی و نا اُمیدی کا فلسفہ ہو۔ اور پھر ایک حقائق سے لبریز نکتہ مُلّا کی طرف مخاطب ہو کر کہتے ہیں مسلمانوں کی حالتِ بد سے بدتر کرنے میں جس قدر مُلّا کا ہاتھ ہے اور کسی کا نہیں۔ یہی ایک واحد ہستی ہے جو قوم کو اُٹھانے کی بجائے تھپکیاں دے دے کر سلا رہی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملّت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوّتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد
اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد!

مسکینیٔ و محکومیٔ و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوّف ہو وہ اسلام کرا ایجاد

اقبالؔ کو مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت کا بڑا احساس تھا۔ وہ حالتِ زار دیکھتے اور پہروں روتے۔ ان کا دل ایک دردِ بیکراں محسوس کرتا۔ ان کی رُوح بے چین ہو جاتی۔ وہ تڑپتے اور قوم کو عمل کرنے کی تلقین کرتے ؎

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونیوالا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں

اقبالؔ اس بات کے قائل تھے کہ غلامی انسان کی اندرونی طاقتوں کو ابھرنے نہیں دیتی۔ انہوں نے قوم کو آزادی کی نعمت سے روشناس کرانے کی بے حد سعی کی۔ ان کے پیغامات میں یہ واضح ہے کہ انسان کو انسان پر حاکمانہ حقوق نہیں۔ انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ اسے قید میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اور اس قید و بند کو توڑنے کی زندگی کے ہر لمحہ میں انہوں نے سعی کی ؎

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی حکما بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک

ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ

اس طرح طالبِ علم سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے کہا ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

اقبال کی شاعری کے متعلق کہا گیا ہے کہ اقبال کی شاعری میں تغزل بھی ہے، ترنم بھی۔ اقبال کی شاعری شوکتِ الفاظ بھی رکھتی ہے اور خیالات کی بلندی اور گہرائی بھی اس کے دامن سے وابستہ ہے اور اس میں غالب کا فلسفہ بھی ہے اور حالی کا قومی جذبہ بھی۔ اقبال کی شاعری کا ہر دور ایک ہی فلسفۂ حیات کا حامل ہے۔

اقبال کے ابتدائی دور میں خیالات کی جدت اور وسعت تو تھی مگر گہرائی کم۔ اور دوسرے دور میں اپنے لئے ایک وسیع میدان مانگنے لگے۔ اور شاعری کی زنجیروں کو توڑ کر ہوا میں بلند ہونے لگے۔ اقبال کے سینے میں دو روحوں کا آشیانہ تھا۔ ایک شاعر کی عشق پرور روح اور دوسری مسلمان کی ہنگامہ خیز اور شورش پسند روح۔ اقبال نے

عشق پروردِ روح کا پیراہن اتنے رنگا رنگ تاروں سے تیار کیا ہے کہ اس کلمہ کی کوئی اصطلاحی یا جامع و مانع تعریف کرنا ناممکن ہے یوں جس طرح شعر کے متعلق تعریفات کا انبار لگا ہوا ہے اقبال کے تصورِ عشق کے متعلق بھی تعریفوں، تشبیہوں اور توضیحوں کی بے حد فراوانی ہے۔

اقبال کے نقادوں کا مجموعی خیال یہ ہے کہ عشق تخلیقی استعداد کے نکتۂ عروج کا نام ہے۔ اور یہ بات انہوں نے یوں بھی کہی ہے کہ جو صلاحیتیں انسان میں بالقوت ہوتی ہیں ان کا بالفعل ہونا عشق کہلاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عشق اس جوہرِ حیات کا نام ہے جو انسان کی فطرت میں مخفی و مستور ہوتا ہے۔ اور جو ذوق و طلب اور سوز و ساز سے متصف ہو کر حقیقتِ مطلقہ کی جستجو کرنا چاہتا ہے معرفت، وجدان اور کشف و الہام کے ذریعہ تحصیلِ علم کو بھی عشق کہا گیا ہے۔ یہ قوت اپنی گوناگوں صفات کی بنا پر مختلف ناموں سے تعبیر کی گئی ہے۔ اکثر عجمی صوفیا یہ کہتے ہیں کہ انسان جو حقیقتِ خداوندی کا ایک جزو ہے اپنی اصل سے جدا ہونے کے بعد پھر اسی حقیقت سے اتصالِ دائمی چاہتا ہے۔ اس آرزو کا نام بھی عشق ہے اور اس طریقے کا نام بھی عشق ہے جس سے کام لے کر انسان حقیقتِ کبریٰ سے اتصال چاہتا ہے۔ اکثر عجمی اکابر صوفیا عشق کا کمال یہ تصور کرتے ہیں کہ انسان کو ہوا و ہوس سے نجات بخشے اور اس میں یہ صلاحیت پیدا کرے کہ وہ عقل اور علم کی بجائے عرفان و وجدان سے کام لے کر اپنی ذات کو ذاتِ خداوندی میں یوں فنا کر دے جس طرح قطرہ سمندر میں فنا ہو جاتا ہے۔ اقبال

اس کے برخلاف یہ کہتے ہیں کہ عشقِ خودی کی ایسی تربیت، عرفان کے ایسے شعور اور ذوقِ جستجو کے ایسے نقطۂ عروج کا نام ہے جسے حاصل کرنے کے بعد انسان فنا نہیں ہوتا۔ اس کی ذات، ذاتِ الٰہی میں مل کر مٹ نہیں جاتی بلکہ اسے بقا کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر انسان عشق کے ذریعہ منزلِ کبریا تک یوں پہنچتا ہے کہ حقیقت کا مشاہدہ کرنے کی تاب لا سکتا ہے لیکن حقیقت میں جذب نہیں ہوتا۔

اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ جس چیز کو اصطلاح میں عشقِ حقیقی کہتے ہیں وہ بھی اسی کیفیت کی ایک صورت ہے جس کا ذکر اقبال کرتا ہے فرق یہ ہے کہ اقبال کا عشق صوفیوں کی اصطلاحی عشق سے زیادہ پیچیدہ ہے اور اس کا اطلاق زیادہ وسیع معانی پر ہوتا ہے میر کا عشق جسمانی اور جمالی ہے۔ اقبال کا عشق عارفانہ ہے۔ اقبال سے پہلے تمام شعراء اسی عشقِ مجازی کے قائل تھے۔ میر اور غالب کا عشق بھی مجازی کا عشق تھا۔ مگر علامہ اقبال عشقِ حقیقی کے قائل تھے۔

عشق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حقیقی عشق۔ دوسرا مجازی عشق۔ حقیقی عشق وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے ہو اور مجازی عشق وہ ہے جو کہ دنیاوی ہو۔ جیسا کہ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کا عشق تھا۔ مگر علامہ اقبال کا عشق عشقِ حقیقی ہے۔ اقبال مرحوم کو بھی اللہ تعالیٰ سے ویسے ہی عشق تھا جس طرح کہ لیلیٰ کو مجنوں سے اور شیریں کو فرہاد سے۔ علامہ اقبال خود اپنے سارے کلام میں عشقِ رسولؐ اور عشقِ حقیقی سے سرشار نظر آتے ہیں۔ وہ اسی عشق کی بدولت کبھی قبرستان میں کبھی بیابان میں اور کبھی جنگلوں، پہاڑوں اور ویرانوں

میں اپنے محبوبِ حقیقی کی تلاش میں نکل جاتے تھے۔ علامہ اقبال کے نزدیک وہ انسان جو سوزِ عشق سے بیگانہ ہیں جن میں عشق کا جذبہ نہیں ہے وہ جسم بے روح سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ایسے انسان کی مثال انہوں نے سیماب سے دی ہے کہتے ہیں کہ پارے سے اگر تڑپ کی کیفیت زائل ہو جائے تو وہ پارہ نہیں بلکہ کچی چاندی رہ جائے گی بس اس طرح انسان جو سوزِ عشق سے بیگانہ ہے وہ جسم بے رُوح سے زیادہ نہیں۔

علامہ اقبال کی ابتدائی نظموں میں ہمیں وسیع و عمیق جذبۂ محبت نظر آتا ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے جو آگے چل کر عشق کا نام پاتی ہے۔ جو اقبال ہمیں آئندہ نظموں میں یہ کہتے ہوئے ملتے ہیں ؎

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

وہی اقبال اپنی ابتدائی عمر میں جب کہ ان کا پیغام وغیرہ کچھ بھی متعین نہ ہوا تھا یہ کہتے نظر آتے ہیں ؎

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

بظاہر اس پہلے دور میں اقبال کی یہ محبت اپنے وطن سے ہے، لیکن وطن نہیں اہلِ وطن بلکہ نوعِ انسانی سے ہے۔ گویا اصل چیز حبِ وطن نہیں محبتِ نوعِ انسانی ہے۔ اسی محبت کو بعد میں انہوں نے عشقِ گرہ کشا کا نام دیا ہے اور آگے

چل کر خودی کی بنیاد بھی یہی عشق قرار پایا ہے ؎

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پہ اسرارِ شہنشاہی

چنانچہ یہ وہ جذبۂ اثر پذیری ہے جس کی بدولت انہیں نطشے کے فوق البشر میں جاذبیت نظر آئی۔ اور اس کے مقابل انہوں نے اپنا تصورِ خیر البشر قائم کیا۔ اور اسی کے معیار پر انہوں نے اپنے زمانے کے لوگوں کو پرکھا۔ اس معیار میں قوت، عظمت اور ہیبت یعنی جلالی پہلو سب سے زیادہ نمایاں تھا اور جس شخص میں انہیں یہ وصف زیادہ نظر آیا اسے اپنی شاعری میں کوئی نہ کوئی مقام عطا کر دیا۔ خواہ نادر شاہ یا سلطان ٹیپو یا محمود غزنوی ہو یا مسولینی اور اسی جلال پسندی کا کرشمہ ہے کہ انہیں نامورانِ اسلام میں سے بھی علیؓ، حسینؓ اور خالدؓ سب سے زیادہ پسند ہیں۔ صدیقؓ، عثمانؓ اور حسنؓ کی طرف ان کی نظر کم تر جاتی۔ پھر یہی رفعت اور ہیبت ہی تھی جس نے اقبال سے مسجدِ قرطبہ کی تعریف کروا ڈالی۔ لیکن تاج محل کے متعلق ایک کلمۂ تعریف بھی نہ لکھوایا۔ ان سب سے بڑھ کر بات دلچسپ یہ ہے کہ اقبال کے ہاں جبریل کی اگر کوئی قدر ہے تو اس کی بلند پروازی کی بدولت، ورنہ اس مقدس فرشتے کے مقابل انہیں ابلیس زیادہ حسین نظر آتا ہے کیونکہ اس میں قوت، خود رائی اور جوششِ عمل کی بے پناہ فراوانی ملتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ جوش اور ولولہ، یہ جوہرِ حیات وہی کیفیت ہزار شیوہ ہے

جسے اقبال عشق کہتا ہے جو کبھی تحصیلِ علم کا وجدانی ذریعہ بنتی ہے اور عرفان کہلاتی ہے جو کبھی زندگی کو دوام بخشتی ہے جو کبھی سوز و ساز اور ذوق و طلب کے مرحلوں سے گزر کر انسان کو ان روحانی بلندیوں تک پہنچاتی ہے جن کا نقطۂ عروج منزلِ کبریا ہے۔ عشق کے جذبے اور شوق کی حالت ہمارے احساسِ ذات کو قوی اور شخصیت کے شعور کو مضبوط بنا دیتی ہے۔ عشق کی کیفیت کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اُن کی نظم 'محبت' کا مطالعہ کرنا چاہیئے جس میں وہ کہتے ہیں کہ عشق کی مدد سے روحِ انسانی غیر فانی بقار حاصل کرتی ہے۔ دُنیا کے ہر ذرّے کے دل میں یہ عشق موجود ہے۔ یہی جذبہ کشش پیدا کرتا ہے اور اسی سے انسان میں تخلیقی استعداد پیدا ہوتی ہے۔

اقبال کے نزدیک عشق ایک ایسا جذبہ ہے ایک ایسا احساس ہے۔ جو صرف انسان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ یہ احساس یہ جذبہ کائنات کی ہر چیز میں دل کی طرح مضمر ہے۔ عشق موجودات میں اسی طرح سرائیت کئے ہوئے ہے جیسے صراحی شرابِ خالص سے بھرپور ہوتی ہے۔ سورج کی رُوح اور چاند کی رگوں کا خون عشق ہی ہے۔ ان کی ہستی کا دارومدار عشق ہی پر ہے۔ ہر ذرّہ کے دل میں عشق کی کسک پوشیدہ ہے یہ عشق ایسا نُور ہے جو ہر شئے سے جھلک رہا ہے۔ کہیں یہ عشق سامانِ عیش و نشاط بن جاتا ہے کہیں سازِ غم کہیں موتی کہیں آنسو اور کہیں شبنم کی شکل اختیار کر لیتا ہے جیسے علّامہ اقبال بھی فرماتے ہیں ؎

کہیں سامانِ مسرت کہیں سازِ غم ہے
کہیں گوہر ہے کہیں رشک کہیں شبنم ہے

علامہ اقبال عشق کے تصورِ مخصوص کی تشریح کرتے ہوئے ذوقِ طلب کو اور سوزِ جدائی کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ یہی ذوقِ طلب ہے جس کی بنا پر انسان نہ صرف دنیاؤں کی تسخیر کرتا ہے بلکہ خود اپنی ذات کے رموز پر بھی مطلع ہوتا ہے۔ سوزِ جدائی سے تمام جذبات مہذب ہوتے ہیں اور عشق کو ترفع کا وہ مقام حاصل ہوتا ہے جہاں جُدائی کا شعور اور حرماں کا احساس پہلے کسک اور پھر ایک خاص قسم کی لذت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

پس علامہ اقبال کا تصورِ عشق ایک زیردست محرک ہے وہ جذباتِ انسانی کا سرتاج ہے۔ یہ محرک شعری دنیا کی ہر قوم کی شاعری کا سرمایہ رہا ہے۔ مولانا روم سے لے کر اب تک ہمارے شعراء نے عشق کو عقل کے حریف کے طور پر پیش کیا ہے۔ اقبال نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اقبال عشق کو عقل کے مقابلہ میں اہم سمجھتا ہے۔

اقبال کے نزدیک عشق ہی جملہ کمالات کا منبع اور تمام فیوض و برکات کا سرچشمہ ہے۔ عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں ہے۔ ہر وقت اور ہر موقع پر اس ہتھیار سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ یہ سراب کو آب اور آب کو سراب بنایا کرتی ہے۔ اور اسی میں اس کا کمال مضمر ہے۔ اس کے سہارے چلنے والے منزلِ مقصود

تک نہیں پہنچا کرتے وہ ہمیشہ سے سرگرداں و حیراں اور گو رو بیاباں ہوتے آئے ہیں اور جنہوں نے عقل کی سرائیمگی کا جائزہ لے کر اسے مناسب حدود میں رکھا اور عشق سے تمسک اختیار کیا۔ وہ کامران ہو گئے ان کا ہاتھ محمل تک پہنچ گیا اور وہ موجِ خرام یار کے تعاقب میں نشانِ راہ بننے سے رہ گئے۔ ان کے نزدیک عشق کائنات کے جملہ اجسام کی حرکت اور ان کے عمل کی روح رواں ہے۔ اسی کے دم قدم سے زندگی کی رنگینی ہے ؎

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

اس کے جوش کی بدولت مذہب میں انہماک، خلوص اور پختگی آتی ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو تو مذہب اپنی تمام کاملیت کے باوجود بے معنی اور جامد ہے ؎

عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

اسی عشق کی مستی سے ممولا شہباز سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے ؎

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

علامہ اقبال عشق کو عقل پر ترجیح ضرور دیتے ہیں اس لئے کہ وہ زیادہ تر عشق کے حامی ہیں اور کبھی کبھار تو وہ عقل کو بالکل ناکارہ و ناکافی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

لیکن ہم یہ نہیں کہتے کہ علامہ اقبال عقل کے دشمن ہیں وہ یہ نہیں کہتے کہ عقل بیکار ہے۔ عقل کی بدولت ہی خارجی اشیاء کی تقسیم بندی ممکن ہے جس کے بغیر انسان کی تصرف و ایجاد کی صلاحیتیں بروئے کار نہیں آسکتیں۔ اقبال کے نزدیک عقل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ مادی اور دنیاوی مسئلوں کو سلجھائے اور اُن کے مخفی پہلوؤں کی عقدہ کشائی کرے۔ اقبال عقل کو زندگی کے خادموں میں شمار کرتے ہیں اور اُن کے نزدیک عقل کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں جرأتِ رندانہ کی کمی ہے۔ جب تک عشق و وجدان اس کی پشت پناہی پر موجود نہ ہوں۔ عقل خود آگے بڑھتے ہوئے ہچکچاتی ہے جہاں وہ پس و پیش اور حیض بیض میں ہوتی ہے وہاں عشق زندگی کے قافلہ کی رہبری، کرتا ہے۔ چنانچہ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ وہ تمام اہم امور جن سے قوموں کی زندگی بدل گئی۔ کسی نہ کسی جذبے کے تحت انجام پاتے ہیں۔ زندگی کے جس چاک کو عقل نہیں سی سکتی اُس کو عشق اپنی کرامات سے بے سوزن اور بغیر تار و رفو کے سی سکتا ہے۔

اقبال کے کلام کا حُسن اس کا خلوص اور مستی ہے۔ اقبال عشق کو عقل پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ وجدان کو ادراکِ حقیقت کا سب سے پُر اعتماد طریقہ سمجھتا ہے۔ دراصل اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ عقل کائنات کے گوناگوں حقائق کا تجزیہ کرنے کی اہل تو ہے۔

لیکن چونکہ اس کے نزدیک انسانی وجود کا مقصود صرف تجزیہ ہی نہیں تسخیرِ کائنات بھی ہے۔ اس لئے عقل اس مقصد کے حصول میں زیادہ مدد ثابت نہیں ہو سکتی ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے
عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں!

چنانچہ ادراکِ حقیقت کے لئے عقل کے علاوہ کوئی اور وسیلہ بھی ہے۔

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

روحانی شاعری کا نکتۂ نظر موضوعی ہوتا ہے وہ اپنے وجدان سے ادراکِ حقیقت کرتا ہے۔ اقبال کے عشق سے مراد ایک قسم کا جوشِ وجدان ہے اس کی خصوصیات مستی اور شدید جذبہ ہیں۔ انسانی ذہن اپنے جوشِ وجدان کی بدولت زمان و مکان کی حدود کو توڑ دیتا ہے جس چیز کو عقل ایک عرصہ تک سمجھنے سے معذور رہتی ہے اسے عشق ایک لمحے میں سمجھ لیتا ہے۔

عشق فرمودۂ قاصد ہے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

اس لئے کہ عقل کا کام شک و شبہ ہے اس لئے تخلیقی عمل میں بہت

سست گام واقع ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل ابھی غبارِ راہ میں گم ہوتی ہے کہ عشق منزلِ مقصود پر جا پہنچتا ہے۔ اقبال نے عشق کو تخلیقِ عمل اور ارتقا کا سرچشمہ قرار دیا ہے اس کے نزدیک زندگی عشق کے نام سے عبارت ہے ؎

عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق فقیہہِ حرم عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ عشق یا انسان کا جوشِ وجدان جب اپنی معراجِ کمال کو جا پہنچتا ہے تو انسان کیا سے کیا ہو جاتا ہے اور اس کے عمل میں کتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے علم و ادراک میں کتنی وسعت اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ عقل ہمیں زندگی کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا حل سمجھاتی ہے لیکن جو شئے ہمیں عمل پر آمادہ کرتی ہے وہ جذبہ ہے اور عشق و ایمان سے زیادہ قوی کوئی جذبہ نہیں اسی لئے مردِ مومن کی قوتِ بازو اور اس کی شوکتِ وجدان کا اندازہ آسان نہیں اس کی نگاہوں سے تقدیریں بدل جاتی ہیں اس کی ہیبت سے کائنات میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے اور اقبال نے انہی خیالات کو اپنے شعر کے قالب میں کہا ہے ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

عشق یا ایمان انسان کو وہ قوت و طاقت عطا کرتا ہے جس سے وہ ایک ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں وہ جملہ موجوداتِ غیبی کا رازدار ہو جاتا ہے اور آخر اسے وہ کیفیت حاصل ہوتی ہے جس کے متعلق اقبالؔ فرماتے ہیں ؎

دو عالم را تواں دیدن بہ بنائے کہ من دارم

کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

اور یہ عشق کا وہ مقام ہے جسے انتہائی سمجھنا چاہیئے اس میں عاشق و معشوق کی انفرادی حیثیتیں باقی نہیں رہتیں اور عشق و ایمانِ کامل کے حصول سے عبدیت کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسے اقبالؔ نے کہا ؎

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من

عشق است امامِ من عشق است غلامِ من

ہنگامۂ ایں محفل از گردشِ جامِ من

ایں کوکبِ شامِ من ایں ماہِ تمامِ من!

پیدا بہ ضمیرم او پنہاں بہ ضمیرم او

ایں است مقامِ او دریاب مقامِ من

اور جب انسان اس مقام پر پہنچتا ہے تو تسخیرِ کائنات اس کے لئے کھیل

بن جاتی ہے اور وہ زمان و مکان سے آگے نکل جاتا ہے جیسے اقبال نے فرمایا ہے۔

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

اور اب جب ہم اقبال کے سینے میں چھپی ہوئی دوسری رُوح جو مسلمان کی ہنگامہ خیز اور شورش انگیز روح ہے کا مطالعہ و مشاہدہ کرتے ہیں تو ہمیں اقبال کی وطن سے محبت کے گہرے نشان ملتے ہیں۔

اقبال کو ہندوستان کی غلامی کا نہایت شدید احساس تھا اور یہ احساس اس کی ان نظموں میں خاص طور پر نمایاں ہے جو اس نے اپنی شاعری کے پہلے دور میں انگلستان جانے سے پہلے لکھیں۔ ان میں تصویرِ دردان کیفیتوں کو سامنے لاتی ہے جو دو بڑی قوموں کے باہمی اختلاف اور ایک بیرونی قوم کے تسلط میں کارفرما تھیں۔ اقبال نے کہا ؎

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑا اس باغ میں گلچیں

تیری قسمت کے جھگڑے ہو رہے ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!

اس نظم میں شاعر کے بیان کی ممتاز ترین کیفیت اس عالمگیر جذبۂ محبت کا اظہار ہے جس نے پہلے وطن اور بعد میں ملت کے عشق کی صورت اختیار کی۔ اور اسی رجحان کی انتہا یہ ہے کہ جب شاعر وطن کی محدود فضا سے کائنات کی غیر محدود فضا کی طرف بڑھتا ہے اور اس کے خمیر میں ملت کے خوبصورت تصور کی تشکیل ہوتی ہے تب مختار عشق و محبت ہی کا اعتماد آفریں سہارا ڈھونڈتا ہے ؎

بیاباں محبت دشت غربت بھی وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی آشیانہ بھی چمن بھی ہے
محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی
جرس بھی کارواں بھی راہبر بھی راہزن بھی ہے
اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو!
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

اور فکرِ وطن اور عشق و محبت کی یہ رُو ح کلامِ اقبال میں اس طرح ہنگامہ آرا ہوئی کہ شاعر اپنا پیام بن کر ہر طرف چھا گیا اور اس پیام کا ردِ عمل آج ہمارے سامنے ہے۔ علّامہ اقبال ایک قومی شاعر کی حیثیت سے ابھرے اور ان کی زندگی آموز فلسفیانہ شاعری نے قوم کو مشعلِ راہ کا کام دیا اور سیالکوٹ کو یہ لازوال اور بے مثال فخر ہے کہ اقبال اس شہر میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے اور اس سال یومِ اقبال اپنے دامن میں یہ خوشگوار کیفیت بھی لے کر آیا کہ جناب مسٹر غلام مرتضیٰ کی دعوت پر جب نیازمندانِ اقبال بلند نظر اور خدا شناس میاں اصغر علی صاحب کی زیرِ صدارت ایک اجلاس میں جمع ہوئے تو فیصلہ کیا گیا کہ اب کے یومِ اقبال کی تقریبات جب منعقد کی جائیں تو اس کا اہتمام شہرِ اقبال کی تمام ادبی انجمنوں کی طرف سے مشترکہ ہو۔

اس تقریب کا اہتمام بڑی خوبصورتی سے کیا گیا اور جب مقالات کا دور شروع ہوا تو احبابِ فکر و نظر ذوق و شوق کے جذبات کے ساتھ محفل میں فروکش تھے اور مفکرِ اسلام سے اپنی والہانہ شیفتگی کا بھرپور مظاہرہ کر رہے تھے۔ رات کا سماں بجلی کے رنگ دار قمقموں سے رنگ و نور کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یہاں اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے مشاعرہ کا اہتمام تھا اور ملک کے چوٹی کے شاعر مدعو تھے۔ سامعین کا اتنا ہجوم تھا کہ مشاعرہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مقالات کی نشست اور محفلِ مشاعرہ دونوں تقاریب

بے حد کامیاب رہیں۔

سیالکوٹ میں علامہ اقبال کی یادگاروں میں اقبال لائبریری۔ اقبال میموریل ہسپتال اور علامہ اقبال کالج قائم ہو چکے ہیں اور اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی جاری تھی کہ اس شہر میں اقبال کے کلام و پیام کو عام کرنے کے لئے ایک اشاعتی ادارے کا قیام بھی عمل میں آئے جو اقبال پر تحقیقی کام کرے۔ الحمد للہ کہ اس مقصد کے لئے اردو ادب اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے۔ اردو ادب اکیڈمی کے زیرِ اہتمام نہ صرف کلامِ اقبال اور حیاتِ اقبال سے متعلق تحقیقی کتابوں کی اشاعت شروع کی جائے گی بلکہ اقبال پر تحقیقی کام کرنے والی شخصیات کے لیکچرز کا سلسلہ بھی شروع کیا جائے گا۔ تاکہ اس شہر میں اقبال کے شائقین اور اقبال کے شیدائی کلامِ اقبال کی روح سے متعارف و متاثر ہوں۔ لہٰذا اس سلسلہ کی پہلی کوشش آپ کے سامنے ہے۔ اُمید ہے یہ کتاب اپنی جدت، اپنے اہم موضوعات اور حسنِ ترتیب و تدوین کے باعث باذوق قارئین سے خراجِ تحسین حاصل کرے گی۔ ہم بھرپور یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس سلسلہ کا نقشِ ثانی ہمیشہ نقشِ اوّل سے بہتر ہوگا۔

اقبال کا مولد

سیالکوٹ کو علامہ اقبال کے مولد ہونے کا لازوال فخر حاصل ہے

یہ ایک صنعتی شہر ہے اور دُنیا بھر کے مہذب ممالک میں اس کی عظمت اور وقار صنعتی ماحول میں چکا چوند پیدا کر رہی ہے۔ اس کی آبادی تقریباً تین لاکھ نفوس پر مشتمل ہے اس عظیم شہر کے رُخ سے اگر ماضی کی تاریخ کے گہرے پردے سرکائے جائیں تو ہمیں اس کی تاریخی عظمتوں کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا۔ سیالکوٹ قدیم شہروں میں سے ایک ہے اور اس نے سینکڑوں روشن اور تاریک رُخ دیکھے ہیں۔ اس شہر کے سینے میں ہندو راجاؤں تاتاریوں اور مغلوں کے تاریخی افسانے پوشیدہ ہیں اور اس کے ذرّے ذرّے میں ہزاروں ہنگامے پنہاں ہیں سیالکوٹ کی ابتدائی تاریخ کی ورق گردانی کرنے پر سب سے پہلے مہابھارت میں ہمیں

اس کا ذکر ملتا ہے۔ ویدک زمانے کی تاریخ میں بھی اس کا ذکر آتا ہے۔ تاریخ ہائے کشمیر، تاریخ ہائے پنجاب ایسی کتابیں بھی سیالکوٹ کی نشاندہی کرتی ہیں۔

مہابھارت کے ذکر میں معلوم ہوتا ہے کہ سیالکوٹ کا نام شاکل نگری تھا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شل نام کا ایک راجہ گزرا ہے جو پانڈو کا رشتہ دار تھا اور یہ خیال اغلب ہے کہ اسی راجہ نے سیالکوٹ کو آباد کیا ہوگا۔ اس تاریخی اشارے کے بعد چھپن سال قبل مسیح میں سیالکوٹ کا ذکر ملتا ہے۔ اس وقت سیالکوٹ کشمیر کا ایک حصہ تھا۔ اور اس پر راجہ سوم دت حکومت کرتا تھا اس کے بعد راجہ سالباہن حکمران ہوا۔ راجہ سالباہن کے دو لڑکے تھے جن میں سے ایک پورن بھگت تھا۔ جسے اس کی سوتیلی ماں نے آتشِ غضب سے مغلوب ہو کر کنویں میں ڈلوا دیا تھا جس کنویں میں پورن بھگت کو ڈالا گیا وہ آج بھی موجود ہے اور ہندو پاک میں اسے ہندوؤں کا متبرک مقام سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ پورن بھگت ایک فقیر منش انسان تھا۔

اس علاقے پر گکھر قوم کے مختلف افراد متواتر حملے کرتے رہے اور ساڑھے تین سو سال تک یہ تاریخی شہر کس مپرسی کے عالم میں رہا۔ ۷۹۰ء میں قلعہ اور شہر کو راجہ شرادت نے یوسف زئی قبیلہ کی امداد سے حملہ کر کے بالکل تباہ و برباد کر دیا۔

اس حملے کے بعد سیالکوٹ کے متعلق تاریخ پھر خاموش ہو جاتی ہے اور ہمیں صرف اتنا پتہ چل سکتا ہے کہ یہ علاقہ مہاراجہ جموں برہم دیو کے تصرف میں چلا گیا۔

۱۱۸۴ء میں جب شہاب الدین غوری نے پنجاب پر حملہ کیا اور شدید لڑائی کے باوجود لاہور پر قبضہ نہ کر سکا تو اس نے اپنے معرکوں کے دوران میں قلعہ سیالکوٹ کی مرمت کروا کر اپنی فوج کا گولہ بارود یہیں رکھا۔ اس کی واپسی کے بعد امیر خسرو صوبہ دار لاہور نے سیالکوٹ پر قبضہ کر لیا۔

چودھویں صدی کے شروع میں جب تیمور دہلی سے واپس لوٹا تو اس کی فوج کے کچھ دستے جموں پر حملہ کرتے ہوئے سیالکوٹ کے قلعہ میں کچھ عرصہ تک اقامت گزیں رہے۔ ۱۵۲۰ء میں جب بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو واپسی پر سیالکوٹ کا علاقہ خسرو کوکلتاش کے قبضہ میں دے دیا۔ اکبر کے زمانے میں سیالکوٹ کو صوبہ لاہور کا پرگنہ بنا دیا گیا۔ اور کشمیر کو تسلط میں لانے کے بعد اکبر خود سیالکوٹ میں مقیم رہا۔ اس زمانے میں راجہ مان سنگھ کو سیالکوٹ اور جموں کی جاگیرداری اور فوج داری عطا کی۔ راجہ مان سنگھ نے سیالکوٹ کی تعمیر و ترقی پر کافی دھیان دیا اور کاغذ بنانے کی صنعت کو خاص طور پر ترقی دی۔ اکبر کے زمانے میں حضرت شاہ حمزہ غوث بڑے متقی بزرگ اور پرہیزگار گزرے ہیں۔ اکبر بادشاہ جب بھی سیالکوٹ آیا آپ کی صحبت میں ضرور حاضر ہوا اور آپ کے کارناموں کے لئے بہت بڑی جاگیر مقرر کی۔ محلہ حمزہ غوث آپ ہی کی جاگیر پر آباد ہے۔ اسی محلہ میں آپ کا مزار اور چلہ گاہ موجود ہے۔ بابا فتح اللہ حقانی بھی اپنے وقت کے صاحبِ کرامت ریاضت گذرے ہیں۔ آپ طویل عرصہ تک سیالکوٹ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ آپ ہی کی محنت

کا نتیجہ تھا کہ مُلّا کمال اور مُلّا جمال جیسے صاحب علموں نے اس منبعِ نور سے روشنی حاصل کر کے گوشے گوشے کو منوّر کیا۔ بابا فتح علی حقانی کے بیٹے بابا عمر حقانی بھی بڑے عالم و فاضل تھے۔ کشمیر کی فتح کے بعد اکبر بادشاہ نے آپ کو دوگاؤں سیالکوٹ میں بطور جاگیر عطا کئے۔ بابا فتح اللہ خاں حقانی کے شاگرد مُلّا جمال کا اصل وطن کشمیر تھا جو حصولِ علم کے لئے سیالکوٹ تشریف لائے۔ مُلّا جمال کے بھائی مُلّا کمال اپنے وقت کے نامور عالم و فاضل تھے۔ یہ دونوں بھائی اپنی قابلیت کی وجہ سے مُلّا حقانی کے داماد بنے۔ مُلّا کمال نے کافی عرصہ خواجہ عبدالرشید نقشبندی کی خدمت میں رہ کر فیضِ باطن حاصل کیا۔ اور مسجد میاں وارث میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ حضرت مجدد الفِ ثانی۔ مُلّا عبدالحکیم اور نواب سعید اللہ خاں وزیرِ اعظم شاہجہان آپ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ محلہ مُلّا کمال آپ ہی کے نام پر آباد ہے۔

شاہجہان کے زمانے میں یہ پرگنہ علی مردان خاں کے تصرف میں رہا۔ اسی زمانے میں شہزادہ مراد بخش کے زیرِ کمان ایک مغل فوج کابل اور پشاور سے ہوتی ہوئی سیالکوٹ کے راستے پٹھانکوٹ پہنچی۔ جہانگیر کے وظیفہ خواروں میں حاجی فتح محمد بھی سیالکوٹ میں صاحبِ کرامت تھے۔ ہندو مسلم بلا تمیز مذہب و ملت آپ کی سخاوت سے مستفیض ہوتے تھے۔ محلہ حاجی پورہ آپ ہی کے نام پر آباد ہے اسی محلہ میں آپ نے ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی آپ کا مزار اسی

مسجد کے قریب ہے۔ حضرت شاہ سید بھی بلند پایہ بزرگ تھے۔ حضرت شاہ دولہ گجراتی انہیں کے مرید تھے۔ آپ کا مزار بازار گندم منڈی میں ہے۔ بہادر شاہ کے عہد میں حضرت شاہ خاکی ولی بہت ہی نیکوکار اور پرہیزگار بزرگ گذرے ہیں۔ آپ اپنا وقت زیادہ تر گوشہ نشینی اور یادِ الٰہی میں گزارتے تھے۔ آپ کا مزار سیالکوٹ کے مشرق میں محلہ رنگ پورہ میں واقع ہے۔ محمد شاہ کے زمانے میں ملکی افراتفری کے نتیجہ میں پٹھانوں کے ایک طاقتور خاندان نے سیالکوٹ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۴۸ء میں محمد شاہ ابدالی نے حملہ کے بعد واپسی پر میر منو کو خاصہ مالیہ ادا کرنے کے وعدہ پر سیالکوٹ کا حاکم بنا دیا۔ اس کے بعد دو سرداروں جھنڈا سنگھ اور گنڈا سنگھ نے حملہ کر کے اس علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۹۰ء میں رنجیت سنگھ کا دورِ اقتدار شروع ہوا اور سکھ قوم کے زوال کے بعد سیالکوٹ پر فرنگی دورِ حکومت مسلط ہو گیا۔

سیالکوٹ کے مغرب میں عیدگاہ کے قریب ایک بہت بڑی فصیل ہے۔ یہ اونچی چار دیواری حضرت شاہ موہگا کے مزار کی ہے جو بہادر شاہ کے عہد میں بہت بڑے خدا پرست اور گوشہ نشین بزرگ تھے۔ آپ اپنے وقت کے قطب اور تاجِ ولایت کے درخشندہ موتی حضرت سیدنا سرمست سیالکوٹی کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ رنجیت سنگھ کے عہد میں راجہ گھمان نے بہت بڑے سکھ وزیرہ سنگھ نے حسنِ اعتقاد سے مقبرہ کی ایسی شاندار عمارت بنوائی

جو قابلِ تعریف ہے یہ مقبرہ فنِ تعمیر کا نمونہ ہے۔

حضرت حافظ برخوردار نوشاہی قادری سلسلہ نوشاہی قادری کے بانی حضرت حاجی محمد شاہ گنج بخش قادری کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ موضع چٹی شیخاں میں پیدا ہوئے۔

آپ حدیث، فقہ، علم الکلام کے کامل عالم تھے اور زبردست شاعر تھے۔ سوہنی مہینوال، یوسف زلیخاں، ہیر رانجھا کے علاوہ بہت سی منظومات آپ نے لکھی ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ گوشہ نشینی میں گزارا۔ آپ صاحب کرامات تھے۔ سید شرف شاہ قلندر رحؒ مشہدی مشہد کے رہنے والے تھے۔ آپ کو بچپن ہی سے اولیاء اللہ سے بے حد عقیدت تھی۔ آپ کو میراں محمد غوث رحؒ المعروف چن پیر رحؒ سے بے حد عقیدت تھی۔ آپ نے چودہ سال حضورِ اکرمؐ کے روضہ مبارک کی خدمت میں گزارے اس کے بعد بغداد شریف، پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار کی زیارت فرمائی بسولہ سال بعد واپس وطن تشریف لائے۔ آپ کا مزار حضرت بابل شہید رحؒ کے پاس ہے۔ حضرت بابا بانگلو شاہ رحؒ تحصیل پسرور میں پیدا ہوئے اور چک سادہ میں سید معصوم علی شاہؒ کی خدمت کر کے کاملِ اکمل بنے ان کے حکم سے بابا دھول شاہ گورکی حاضر ہوئے اور بقیہ عمر یہاں ہی گزاری۔ آپ کا مزار بابا دھولو شاہؒ کے قریب موجود ہے۔ جہاں ہر سال دو مرتبہ عظیم الشان

میلہ منڈی لگتی ہے۔ سیالکوٹ میں آج بھی بے شمار تاریخی عمارتیں اور مقامات موجود ہیں۔ ان میں قلعہ پورن بھگت کا کنواں، روضۂ امام صاحب، روضۂ پیر مرادیہ، مسجد عبدالحکیم اس کے علاوہ حکیم الامت کے اس مکان کو بھی جہاں وہ پیدا ہوئے اور پروان چڑھے، ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بازار حکیماں کے وسط میں واقع ہے۔ اور سیالکوٹ کو علامہ اقبال کی جائے پیدائش ہونے کا جو لازوال فخر ہے اس کے مقابلے میں اس کی باقی تاریخی شہرت بھی ماند پڑ جاتی ہے۔

سید اختر الاسلام
۱۳۶۔ شاہ نتھن میرٹھ۔ ایم۔ اے انگریزی و اُردو (ریسرچ سکالر میرٹھ یونی ورسٹی میرٹھ)

اقبال اور مسجدِ قرطبہ

(ایک جائزہ)

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی مسدس میں ضمنی طور پر مسجد قرطبہ کے بارے میں جو کچھ کہا اس کی تفصیل اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ میں ملتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال نے مسجد قوۃ الاسلام اور سپرس کی مسجد کے بارے میں بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ مگر مسجد قرطبہ کی زیارت سے اُن کے دل پر جو جذبات طاری ہوئے کسی اور اسلامی مسجد کی زیارت پر نہ ہو سکے۔

محمد اکرام صاحب نے اپنے "اقبال نامہ" میں اقبال کے ایک بیان کا حوالہ دیا ہے جس سے اس مسجد کے تاریخی و تہذیبی پس منظر کی عکاسی ہوتی ہے:

"میں اپنی سیاحتِ اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ الحمرا کا تو مجھ پر زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھ کو جذبات کی ایک ایسی رفعت تک پہنچا دیا

جو مجھے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اندلس کی بعض عمارتوں میں اسلامی فنِ تعمیر کی ایک خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قوٰی شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصرِ زہرا دیودں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ الحمراء مہذب انسانوں کا اور مسجد قرطبہ مہذب دیووں کا۔"

واقعی انسانی شعور و ادراک سے بلند یہ بات ہے کہ کس طرح انسان نے اکیس دروازوں والی ۱۹۰ گز لمبی اور ۷۵ گز چوڑی مسجد جس میں ۲۸۵ جھاڑ فانوس روشن ہوتے تھے ڈھائی برس میں تعمیر کی ہوگی (شورش کاشمیری)

علامہ اقبال نے اپنی یہ نظم ۱۹۳۳ء کے اوائل میں کہی۔ یہ وہ وقت تھا جب شاعرِ مشرق ذہنی اور فکری ارتقا کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا ہوا تھا اسی لئے اس کے ذہن اور مسجد قرطبہ کے حالات میں ایک زبردست مشابہت نظر آتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کے شارحین، مداحین اور ناقدین نے اقبال کے کلام و بیان کے ضمن میں اس مسجد کی تعمیر، اس کے تعمیراتی حُسن، اس کی تاریخی عظمت اور تاثراتی کیفیت و جذباتیت کے سلسلہ میں بے حد دلکاست بحث کی ہے۔ بالِ جبریل کی نظموں (جن میں اقبال فلسفہ کی انتہائی بلندیوں پر ایستادہ ہیں) میں یہ نظم آج بھی اپنا وہی تاثر بنائے ہوئے ہے۔

اس مسجد کا حزنیہ پہلو جس نے اقبال کو یہ نظم تخلیق کرنے کی تحریک دی

یہ ہے کہ یہ مسجد جو آٹھویں صدی عیسوی میں عبدالرحمٰن اوّل کے ہاتھوں تعمیر ہوئی پانچ سو برس مسلمانوں کے قبضے میں رہنے کے بعد اُن کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ اور ۲۹ جون ۱۲۳۶ء کو گیسٹیل کے شہنشاہ فرڈی نینڈ نے عیسائی پادریوں اور سپاہیوں کے ساتھ اس کو فتح کر لیا اور اس کی ایک قدآور محراب کے سائے میں سینٹ میری کا ایک کلیسا قائم کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود اسے مسجد کے مخصوص فنِ تعمیر اور نقوش کو مسخ کرنے کی جسارت نہ ہوئی۔ پھر پندرھویں صدی عیسوی میں ہسپانیہ کے شہنشاہ چارلس ثالث کی اجازت حاصل کر کے ستمبر ۱۵۲۳ء سے مسجد کے ایک اور حصّہ کو عیسائی طرزِ تعمیر کی شکل دی گئی۔ مگر ۱۵۲۶ء میں جب چارلس قرطبہ کے دورہ پر آیا تو وہاں کا منظر دیکھ کر کہا "اگر میں جانتا کہ تمہارا کیا ارادہ ہے تو تم ہرگز کچھ نہ کر سکتے تھے کیونکہ جو کچھ تم نے کیا ویسا تو ہر جگہ ملتا ہے۔ لیکن یہ توڑ پھوڑ اور تخریب کاری دنیا میں نہیں ملتی۔"

اقبالؔ نے تاریخ کی روشنی میں اس مسجد کو دیکھا تو ان کی آنکھیں خونِ جگر اگلنے لگیں۔

ہائے، وہ جلیل القدر مسجد جس کی توسیع کے لئے منصور ابنِ عامر نے فرداً فرداً لوگوں کے پاس جا جا کر خاطر خواہ معاوضہ دیا اور کہا تھا کہ مسلمانو، میں تم سے خدا کے گھر کی توسیع کے لئے آس پاس کی عمارات اور تمہارے مکانات خریدنا چاہتا ہوں۔ تم قیمت لو اور اپنی جائے رہائش مجھے دے دو۔ یہیں ابنِ ماجہ،

ابن طفیل، ابن ظہر، ابن حزم، ابن خلدون (۱۴۰۶-۱۳۳۲) جیسے جلیل المرتبت عرب علما، فضلا اور محدثین جنہوں نے یورپ کو علم و فن اور تہذیب و شائستگی سے متعارف کرایا اور نشاۃ ثانیہ کو تحریک دی سکونت پذیر تھے۔ یہیں کی چٹائیوں پر راجر بیکن نے زانوئے تلمذ طے کیا تھا۔ اسی کے زیرِ سایہ دارالفنون پیرس اور یولونا کی یونیورسٹی میں ابن رشد کا غلغلہ صدیوں تک بلند رہا۔ اسی مشہور و معروف خطۂ زمین پر آباد اس مسجد کی دگرگوں حالت ہو گئی تھی۔ اقبال اس وقت گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد بلادِ شرقیہ کا سفر کر رہے تھے۔ تب سات سو سال بعد انہوں نے مسجد کی زبوں حالی دیکھی۔ اور کچھ تو نہ بن سکا۔ انہوں نے وہیں اذان دے کر تحیۃ المسجد نماز ادا کی اور جو دعا مانگی وہ نہ صرف شرفِ قبولیت کو پہنچی بلکہ ان کی کیفیات و واردات کو اپنے اندر جذب کرتی چلی گئی۔ اس دعا نے ایک وسیلہ کا کام انجام دیا جس کا ثمرہ ان کی نظم مسجد قرطبہ ہے۔

"یہ نظم جدید اُردو ادب کا شاہکار ہے۔" (ڈاکٹر یوسف حسین خاں)

"جس میں اقبال نے اثر آفرینی سے ایک طلسم پیدا کر دیا ہے۔" اس نظم میں آرٹ، تاریخ، فلسفہ کی حسین آمیزش ہے۔ انہوں نے چند اشاروں میں ہسپانیہ کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے۔ لیکن یہ چند اشارے ضخیم تاریخوں پر اس لئے بھاری ہیں کہ یہ نظم ایک جلیل القدر قوم کی جفاکشی، مہم جوئی

اور بلند خیالی کی زندہ جاوید تصویر پیش کرتی ہے۔ شاعر کے ذہن میں اس قوم کو جگانے کا جذبہ ہے جس نے مسجدِ قرطبہ کی تعمیر کی "

غلام حسنین صاحب بلگرامی (قواعد العروض) نے اس کی تقطیع کرتے ہوئے یہ حقیقت آشکار کی ہے کہ اس نظم کی بحر عروض کے دائرہ مشتبہ مزاحمقہ کی بحر منسوخ ہے جو کہیں مطوی موقوف اور کہیں مطوی مکسوف ہے متفعلن فاعلن یا فاعلان۔ کہیں کہیں دوسرا اور چہارم رکن بھی فاعلات بن گیا ہے۔ فارسی کے قاعدے کے مطابق بحر مثمن الارکان استعمال کی گئی ہے۔ اس بحر کا نام انسراح سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں آسانی و روانی، مفارقت اور جامے سے باہر ہو جانا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ نظم میں رمزیت کے اندر رومانیت کے اجزا شامل ہو گئے۔ ساتھ ہی کلاسیکیت میں رومانیت کا امتزاج پیدا ہو گیا۔

(عبد السلام ندوی: اقبال کامل ص ۹۶-۱۹۵)

اس نظم کی تخلیق کرنے میں اقبال کا یہ جذبہ و عقیدہ کارفرما ہے کہ انسان اپنے عمل کی قوت سے ہر ماحول پر قابو پا سکتا ہے اور ہر جگہ رچ بس سکتا ہے۔ وہ کسی ایک سرزمین سے وابستہ نہیں کیونکہ انسان کی فضیلت خاک کی بدولت نہیں اس کے سوزِ دروں کی بدولت ہے۔ یہی اقبال کا آفاقی پیغام ہے جس کو محدود ذہن اور تنگ نظری کی کسوٹی پر رکھ کر انہیں خالص اسلامی شاعر بنا دیا گیا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اقبال تعصب اور تنگ نظری کا بری طرح شکار ہو گئے۔

اس نظم کے آٹھ بند ہیں اور ہر بند میں آٹھ آٹھ شعر ہیں۔ ہر ایک بند میں ایک مرکزی خیال موجود ہے۔ جس میں زمانہ کی حقیقت اور کارِ جہاں کی بے ثباتی، عشق کی صفات، مسجدِ قرطبہ سے خطاب (کہ اس کی بنیاد عشق پر رکھی گئی) مسجد کی شان و شوکت اور ملّتِ اسلامیہ کا مژدۂ جاں فزا، مردِ مومن کا دقیع تصور، عربوں کی فتوحات اور عظمتِ رفتہ، یورپی انقلابات، مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی پیش گوئی شامل ہے (پروفیسر یوسف سلیم چشتی)

اقبال کے اسی طرح کے طرزِ بیان سے تو شاعری کو الہامی چیز تصور کیا گیا۔ اور یہی محاسن ان کے فلسفۂ خودی کے محرک ہیں۔

عمیق حنفی (اوراق لاہور جنوری فروری ۱۹۷۶ء) کے تجزیہ کے پیشِ نظر مسجد قرطبہ کے آٹھوں بند میں تقریباً سوا ہزار الفاظ ہیں اور بارہ سو سالہ تاریخ، تہذیب، فنونِ لطیفہ، سیاسی منظر اور مذہبی عقائد کا نچوڑ شاعری کے کوزے میں بند کیا گیا ہے۔ گویا ایک لفظ ایک سال پر محیط ہے۔ نظم کا صوتی آہنگ اس کے لہجے کو وقار، متانت، وزن اور سنجیدگی عطا کرتا ہے۔ ہر بند کا پہلا شعر مطلع ہے۔ اس کے بعد چھ اشعار اس کے ہم قافیہ ہیں۔ اور آخری شعر بند کا ہے جس کے دونوں مصرعے منفی تو ہیں لیکن سات اشعار کے قافیے سے الگ قافیہ رکھتے ہیں۔ بند کے تمام اشعار مردّف بھی ہیں۔ چھ چھ بند کے ۴۵ اشعار مضمتہ الآخر ہیں۔ دادالکبیر (قرطبہ کا دریا جس کے کنارے مسجد قرطبہ

واقع ہے) کا آبِ رواں تھپروں اور چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر جس طرح پلٹتا ہے اور پلٹ پلٹ کر جس طرح ٹکراتا ہے اس کا صوری اور صوتی جواب موجودہ نظام قوافی سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا۔ معنوی اور کیفیتی سطح پر مضمونوں پر ختم ہونے والے یہ اشعار ذہن و قلب میں شورش بپا کر دیتے ہیں اور محو مجادلہ افکار و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ عمارت کا ڈھانچہ اس تناسب اور توازن والی موسیقار انہ فکر کی ترتیب دی ہوئی کمپوزیشن کا احساس دلاتا ہے۔ فکر و احساس کا ہیجان و بحران پانچویں بند (مردِ مومن کا دقیع تصور) میں عروج پاتا ہے اور چھٹے بند (عرب فتوحات اور عظمتِ رفتہ کی یاد دہانی) میں اس نقطہ پر قائم رہنے کے بعد ساتویں (یورپ کے چند اہم انقلابات) اور آٹھویں بند (الہامی رنگ میں مسلمانوں کی دوبارہ فتح کی خوش خبری) میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

اقبال نے مسجد قرطبہ نظم میں جس انداز کی جذبات نگاری کی ہے مسجد واقعی اس کی اہل ہے۔ اور کسی دوسرے شاعر میں اتنی وسعتِ کمال نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس پُر شکوہ، عالی شان تاریخی نظم کہہ سکے۔ اس کا واحد سبب شاید یہ ہے کہ اقبال پر دنیا کے بڑے مذہب کی گرفت اتنی نہیں جتنی ایک بڑی شخصیت (سرورِ کائنات محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہے۔ (رشید احمد صدیقی)، کیونکہ اس میں یقین و محبت کارفرما ہے اور "جس کلام میں یقین و محبت کی روح کارفرما نہیں تو وہ ایک حقیقی اور موزوں کلام تو ہو سکتا ہے لیکن

زندہ جاوید کلام نہیں ہو سکتا۔" (ابوالحسن ندوی : روائع اقبال) علاوہ ازیں "اقبال کا کلام شعور و احساس، قلب و وجدان اور اعصاب میں حرکت و حرارت، سوز و گداز، درد و تپش پیدا کرتا ہے اور پھر ایک ایسا شعلہ بھڑک اٹھتا ہے جس کی گرمی سے مادیت کی زنجیریں پگھل جاتی ہیں۔"

کہا جاتا ہے کہ بعض شعرا نے اقبال کے رنگ کو اختیار کرنے کی کوشش کی اور ایسا اس لئے ممکن ہے کہ نقل کرنا انسان کی جبلت و خاصیت ہے۔ لیکن اسلوبِ اقبال اتنا نادر اور عظیم الشان ہے کہ اس کی مستقل تقلید ممکن نہیں۔ (عاصی کرنالی) اور یہی وجہ ہے کہ جیسے حالی کی مسدس کے جواب میں بیش تر مسدسیں لکھے گئے مگر کوئی بھی حالی کی گرد کو نہ پہنچ سکا وہی حال اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ کے سلسلے میں بھی ہونا ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب مقلدین کا کلام صفحۂ ہستی سے معدوم ہے۔ اگر یہ لوگ تقلید کے بجائے اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرتے تو یہ اُن کا حُسنِ ظن ہوتا جیسا کہ دورِ حاضر کے چند شعراء ۔ عزیز اندوری، خاموش فاروقی، محمد مشتاق شارق میرٹھی، سید غلام سمنانی جونپوری، قیام الدین مضطر، وغیرہ نے اپنی شعری کاوشوں کے تحت مسجد قرطبہ پر اپنے جذبات کی ترجمانی کی۔ ان شعرار کرام کو یہ سعادت اقبال کی نظم سے ہی ممکن ہو سکی۔ شعرار کی یہ تخلیقات اس لئے قابلِ ذکر ہیں کہ ان سے علامہ اقبال کی صحیح جذبات نگاری مترشح ہوتی ہے۔ اس تقابلی مطالعہ سے بآسانی یہ حقیقت منکشف ہو سکتی ہے کہ ان نظموں میں سے کوئی بھی

علامہ اقبال کی نظم کی رفعت و عظمت کو نہیں چھو سکتی کیونکہ اقبال جیسا مردِ مومن کا تصورِ جگا مے والا اب ناپید ہے تاہم یہ نظمیں اردو کی اچھی نظموں میں ضرور شمار کی جا سکتی ہیں۔

مسجدِ قرطبہ کی واپسی از محمد مشتاق شارق میرٹھی

کہکشاں و مہر و ماہ گنبد و دیوار و در
دیکھیے جس نقش کو ہے وہی نامعتبر
ہاں مگر تو ہے کہ ہے عشق سے پائندہ تر
اے حرمِ قرطبہ اے حرمِ قرطبہ

دن ترا مہرِ جمال شب تری بدرِ منیر
نور ہے تیرا خمیر نور ہے تیرا ضمیر
لائے کہاں سے کوئی ڈھونڈ کر تیری نظیر
اے حرمِ قرطبہ اے حرمِ قرطبہ!

حسنِ ازل کی جھلک تیرا جلال و جمال
تیری زمیں جاوداں تیرا فلک لازوال
تو ہے آپ اپنا جواب تو ہے آپ اپنی مثال
اے حرمِ قرطبہ اے حرمِ قرطبہ۔

بوئے وفا آج بھی تیری ہواؤں میں ہے
حسن حجاز و یمن تیری فضاؤں میں ہے
قافلۂ حق کا سوز تیری نواؤں میں ہے

اے حرمِ قرطبہ اے حرمِ قرطبہ

ہو گئی پھر یک بیک تیری زمین آسماں
پھر ترے نقش و نگار بن گئے عظمت نشاں
جھک گیا قدموں میں پھر حسنِ زمان و مکاں

اے حرمِ قرطبہ اے حرمِ قرطبہ

رہ گئی حق کی صدا لٹ گیا باطل کا نام
بن گئی تیری غلام کشمکشِ صبح و شام
عشق ہے تیرا جمال عشق ہے تیرا دوام

اے حرمِ قرطبہ اے حرمِ قرطبہ

چھا گیا ہر نقش پر نورِ دلِ جبرئیل
تیری خاکِ فرش پر بن گئی کشتِ نخیل
آ گیا پھر لوٹ کر عہدِ ذبیح و خلیل

اے حرمِ قرطبہ اے حرمِ قرطبہ

پھر ہوئے حق آشنا تیرے نشان و حدود

پھر فضاؤں میں تیری گونجے اذان و درود
پھر تیری محراب نے دیکھے قیام و قعود
اے حرمِ قرطبہ اے حرمِ قرطبہ

تیرے اُفق پر عیاں ہو گیا پھر آفتاب
بن گیا تعبیر صدق شاعرِ مشرق کا خواب
رُوحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب
اے حرمِ قرطبہ اے حرمِ قرطبہ

(مطبوعہ نیا دور لکھنؤ)

مسجدِ قرطبہ کی واپسی ـــــ از غلام سمنانی جونپوری

غلام سمنانی صاحب کی یہ نظم چار بند پر مشتمل ہے اور ہر بند میں ۱۷ اشعار ہیں۔ ۱۶ اشعار بند کے اول ایک بیت ہے۔ یہ چاروں بند اقبال کی نظم کے شروع کے پہلے چار بند کے ردیف قافیے پر ہیں۔ اس نظم کے سلسلے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے برادرِ خورد جناب نیاز احمد صدیقی صاحب کو آپ یکم نومبر ۱۹۷۴ کے خط میں لکھا تھا "نظم بہت اچھی ہے شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔ اقبال کے کلام کا اتنا اچھا تتبع اب تک اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نظر نہیں آیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سید غلام سمنانی صاحب کی شعری

صلاحیتیں کتنی غیر معمولی ہیں لیکن کسی بڑے شاعر کی اس درجہ پیروی بعض اوقات تبع ان تخلیقی قوتوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ معیار و منہاج کے طور پر اقبال کے کلام کو پیشِ نظر رکھنے میں کوئی ہرج نہیں لیکن اپنی انفرادیت کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔"

ہے نگہہ اشتیاق محو تماشائے ذات — توڑ دیئے عشق نے عقل کے لات و منات

عشق ہے فتحِ مبیں عشق ہے نورِ یقیں — عشق غیور و متیں عشق ہے صبر و ثبات

عشق کا سوزِ نفس گرمیِ بازارِ شوق — عشق کا اشکِ رواں دجلہ و نیل و فرات

کوہ کن و قیس ہیں بندۂ بے دامِ عشق — عشق رئیس الکلام عشق امیر الثقات

عشق ہے مہرِ منیر عشق سے روشن ہوئی — تیرہ و تاریک تھی انجمنِ کائنات

جنبشِ ابروئے عشق جنبشِ بالِ قضا — فتنۂ یوم النشور عشق کی ادنیٰ سی بات

مٹ گئی اک آن میں کشمکشِ جسم و جاں — اٹھ گیا اک آن میں پردۂ ذات و صفات

وسعتِ دستِ طلب عشق کی فردوسِ جاں — نیشِ غمِ جاوداں عشق کی شاخِ ثبات

مرحلۂ عشق میں خارِ الم گل بدوش — مے کدۂ عشق میں زہر ہے آبِ حیات

عشق کی تقدیر ہے آتش خوں دار و گیر — عشق کو پیش آئے ہیں ایسے بہت سانحات

عزم و عمل کے لئے کچھ نہیں ارض و سما — عزم و عمل کے لئے کچھ نہیں یہ شش جہات

زیرِ قدم آگیا خیمۂ عرشِ بریں — ہو گئی ہے ریزہ ریزہ شیشہ گہِ ممکنات

میرے جنوں کا صلہ مملکتِ تحت و فوق — عقل زیاں کوش ہے میرے جنوں کی زکات

مجھ پہ ہوئے منکشف لوح و قلم کے رموز — پوچھ لے مجھ سے کوئی رازِ حیات و ممات

شاطرِ تقدیر نے چال کچھ ایسی چلی — دیکھتے ہی دیکھتے کھا گئی تدبیر مات
کتنے دلوں پر ملا عشق کو اذنِ سجود — پھر وہی جوشِ اذاں پھر وہی لطفِ صلات

چشمِ تمنّا میں ہے حُسنِ سراپائے دوست
سامعہ افروز ہے لذّتِ آوائے دوست

قافلۂ وقت ہے گرمِ رَوِ تیز گام — کس کے لئے ہے قعود کس کے لئے ہے قیام
کمتر از برگِ خشک کمتر از ریگِ دشت — وقت کے صحرا میں یہ شام و سحر کے خیام
وقت کے دریا کی موج جوشش طوفاں بہ دوش — وقت کا ساحل نہیں اس کا نہیں ہے مقام
وقت کے تیشہ سے آب زہرۂ فولاد و سنگ — کوشک دیوان و کاخ قصر در سقف و بام
وقت کی تیغِ اصیل وقت کی شمشیرِ تیز — بے جگر و بے خطر و بے خبر و بے نیام
وقت کے محکوم ہیں قیصر و خاقان و میر — خواجہ و شاہ و سپاہ وقت کے ادنیٰ غلام
وقت سکوں ناشناس وقت ہے شورش اساس — وقت کا رہوار ہے تند رَو و بے زمام
مرغِ بلند آشیاں اس کا اسیرِ فریب — وقت کا صیاد ہے تیز نگہ تنگ دام
وقت کے معبد میں سب محوِ رکوع و سجود — وقت کے سب مقتدی وقت ہے سب کا امام
کس کو ملی ہے یہاں رخصتِ اظہارِ شوق — کس کو ملی ہے یہاں فرصتِ عیشِ دوام
خوابِ پریشاں سے کم آرزوئے دل نہیں — خواہشِ عیشِ دوام ایک تمنّائے خام
وقت کی اک آن ہیں ماضی و فردا و حال — وقت کی اک شان ہیں انجمنِ صبح و شام
وقت عظیم و جلیل وقت محیط و بسیط — وقت کو کچھ مت کہو یہ ہے کسی کا پیام

وقت ہے درمان درد وقت دمِ گرم و سرد
وقت ہی خود زخم ہے وقت ہی خود التیام

وقت نہیں بے حدود وقت نہیں بے ثغور
اس کی بھی ہے انتہا اس کا بھی ہے اختتام

وقت ہے سیلِ رواں عشق ہے کوہِ گراں
وقت کے اس سیل کو عشق ہی لیتا ہے تھام

عشق ازل آشنا عشق ابد اختیار
عشق ہے دارالبقا عشق ہے دارالقرار

اب نگہِ شوق میں غیب ہے عینِ شہود
راز کہاں رہ گیا عالمِ بود و نبود

شاہدِ تقدیر نے رُخ سے الٹ دی نقاب
پھر وہی ذکرِ جمیل پھر وہی گفت و شنود

عشق پہ تیری بنا عشق ہے تیرا خمیر
ہے یہی رازِ دوام ہے یہی رازِ خلود

نقش ترا لازوال نقش ترا بے مثال
کام تو کچھ کر گیا عشق کا ذوقِ نمود

جس کے تھے قلب و نظر جلوہ شناسِ ازل
تھا وہ یقیناً ترا نقشِ طرازِ وجود

جس کے ہنر نے کیے جمع بہ حسن و کمال
کسوتِ تہذیب کے بکھرے ہوئے تار و پود

جس کو بہا لے گیا ساحلِ مقصود تک
لطمۂ بحر عطا موجۂ دریائے جود

جس کی امیری سے تھا حُسنِ فقیری عیاں
جس کی نگاہوں میں ہیچ خوفِ زیاں شوقِ سود

راز کے بندِ قبا کھل گئے اک آن میں
عقدۂ مشکل کی تھی جس سے کشاد و کشود

اس کی نگہ دل کشا اس کی ادا حق نما
کتنے ہی فتنے اٹھے زیرِ سپہرِ کبود

بزم گہِ ناز میں جلوہ فزائے کرم
رزم گہِ کار میں ہوش ربائے جنود

زورق و طوفاں شکن مرد زن و جاں شکن
قیصر و خاقاں شکن اس کا قدم دو ورود

جس کا خیال و عمل باعثِ تجدیدِ شوق
جس سے کہ توڑا گیا مغربیوں کا جمود

خلوت و جلوت میں تھا نقش گرِ مدِّ یقیں
اس کا قیام و قعود اس کا رکوع و سجود

اس کا امینِ عطا شاہدِ تہذیب و فن
اس کی رہینِ کرم کارگہ دیر و زود

کتنے دنوں تک رہا سازِ نوا بے خروش
کتنے دنوں تک رہی محفلِ جاں بے سرود

اک نئے عنوان سے جشنِ بہاراں ہوا
جشنِ بہاراں ہوا رقصِ نگاراں ہوا

تیرے ہر اک سنگ میں نورِ دلِ جبرئیل
تو ہے عدیم النظیر تو ہے عدیم المثیل

تیری ہر اک خشت میں خونِ رگِ دلبری
تیرا ہر اک پیچ و خم رقص گہ سلسبیل

منبر و محراب و در یہ تیرے نقش و نگار
مصدرِ خیرِ کثیر مرکزِ اجرِ جمیل

تیری بلندی سے پست رفعتِ چرخِ بریں
تجھ سے ہوا فرشِ خاک کتنا عظیم و جلیل

جس کی بہاروں سے فاش رازِ بہارِ ارم
تیرے وہ گلزار و باغ تیری وہ کشتِ نخیل

حکمتِ تعمیر کو تجھ سے ملی آب و تاب
حکمتِ تعمیر کا تیری نہیں ہے عدیل

ہمسرِ ابروئے زیست تیرا دودِ چراغ
تیری کفِ خاک سے دیدۂ مغرب کحیل

شمعِ رہِ دیں بنی عظمتِ مغرب ہیں تو
علم و ہنر کے لئے تیری بنا سنگِ میل

مجھ کو ہے معلوم تھا کون وہ آذر تیرا
آہ وہ فردِ فرید آہ وہ مردِ نبیل

مرحلۂ حق میں تھا صبر و رضا کا نقیب
جس سے ہوا آشکار سرِّ ذبیح و خلیل

اس کا عمل اس کا عزم اس کا حشم اس کا حزم
چشمِ جہاں کے لئے ایک کتاب الدلیل

جس کی زرہ لاالٰہ جس کی پنہ لا الٰہ
جس کے لئے کچھ نہیں تیغ و سناں اسپ و فیل

عرصۂ پیکار ہیں قلزم و ذخّار میں
کچھ نہ رہا کیف و کم کچھ نہ رہا قال و قیل

بن گیا مضرابِ جاں بن گیا مہمیزِ شوق
اس کے قلم کا صریر اس کے فرس کا صہیل

بندۂ مومن کی رُوح تجھ سے ہے پرتوفشاں
وہ بھی نہیں مستمیل تو بھی نہیں مستمیل

پھر ہے وہی رستخیز پھر وہی شورِ ستیز
تازہ نہ ہو جائے پھر قصۂ فرعون و نیل

ضربِ کلیمی بھی ہے اور یدِ بیضا بھی ہے
ساحرِ عصرِ جدید تو نے یہ دیکھا بھی ہے

(مطبوعہ معارف اعظم گڈھ)

مسجدِ قرطبہ از قیام الدین مضطر

مسجدِ قرطبہ جائے امن و اماں
تیرے اوصاف کوئی کرے کیا بیاں

اک حقیقت ہے تو اک فسانہ ہے تو
تیرے اذکار میں ہیں دفاتر نہاں

ہے عجائب میں تو اک عجب شاہکار
ایک سُلطان کی ہے حسیں داستاں

تیرے جلووں کی تابندگی یہ فضا
جیسے نورِ سحر تابشِ کہکشاں

یہ در و بام تیرے منارِ بلند
یہ بنا یہ ستوں، یہ نشاں بادواں

درسِ وحدانیت کی ہے تو آماج گاہ
نغمہ اللہ ہو، یہ صلوٰۃ و اذاں

تجھ سے وابستہ ہے زندگی کا شعور
تجھ سے ملتا ہے منزل کا اپنی نشاں

کفر و باطل کے حق میں تو شمشیر ہے | تجھ سے اسرارِ ہستی ہوئے ہیں عیاں
سر جھکایا یہاں آ کے اقبال نے | اور پختہ کیا اپنا عزمِ جواں

ایک شاعر ہے مضطر خدا کے لئے
رازِ سربستہ کچھ اس پہ بھی کر عیاں

(مطبوعہ پندرہ روزہ ارضِ وطن دہلی ۱۵ فروری ۷۷ء)

حرمِ قرطبہ از عزیز اندوری

عزم و یقین کا نشاں | پرچمِ جذبۂ اماں
حق و عمل کی پاسباں

سرِّ وجودِ ذات ہے | حاصلِ کائنات ہے
عکسِ جبینِ عابداں

نقش و نگارِ حریت | شکلِ تمامِ عاطفت
صورتِ قلبِ عارفاں

منبعِ نورِ ذوالجلال | مرجعِ فکرِ خوش خصال
ارضِ یقینِ ضو فشاں

مرکزِ علم و فن ہے یہ | حاصلِ حق سخن ہے یہ

کاشفِ سرِ دوجہاں

گنبدِ صبح ضو فگن
نیرِ صدق کی کرن

رشکِ جمالِ مہ جہاں

تیرہ شبی کی کیا مجال
ڈالے کمندِ بد خصال

رعب و جلال الاماں

(مطبوعہ پاکیزہ ڈائجسٹ دہلی مارچ ۱۹۷۷ء)

مسجدِ قرطبہ از خاموشؔ فاروقی

مسجدِ قرطبہ تو ہے جنت نشاں
تو ہے دار السکوں تو ہے دار الاماں

مردِ مومن کا دل مردِ مومن کی جاں
آج پھر تیری وادی میں گونجی اذاں

مسجدِ قرطبہ مرحبا مرحبا

عشق کا تو صلہ مسجدِ قرطبہ

تجھ کو چھو کر گذرتا ہے دادالکبیر
تو عجائب میں خود ہی ہے اپنی نظیر

تو ہے حسنِ ازل تو ہے عشقِ ابد
نور ہے تو بنی نور تیرا خمیر

نور ہی ابتدا نور ہی انتہا

عشق کا تو صلہ مسجدِ قرطبہ

تیرے اوصاف کیا کیا کروں میں بیاں
تیری عظمت سے واقف ہے سارا جہاں
تیرا ثانی زمانے میں کوئی نہیں
تجھ سے ہے سرزمینِ وفا جاوداں
اہلِ ایماں کے خوابوں سے آراستہ
عشق کا تو صلہ مسجدِ قرطبہ

تیرے در تیری دیواریں لعل و گہر
جگمگائیں جو مانندِ شمس و قمر
عبدِ رحمٰن اوّل کا تو ہے شجر
ابنِ عامر کی تو کاوشوں کا ثمر
شام تیری پھبن صبح تیری ادا
عشق کا تو صلہ مسجدِ قرطبہ

تو ہے دنیا میں پیغام امن و اماں
ہے منوّر ضیاؤں سے تیری جہاں
تیرے ماحول میں گونجی حق کی صدا
تیرے مینار و گنبد ہیں عظمت نشاں
درسِ وحدانیت ہے تیرا مدعا
عشق کا تو صلہ مسجدِ قرطبہ

سر پہ تیرے رہے کتنے رنج و الم
تو نے صدیوں سہے ہیں جہاں کے ستم
صبر کی تو نے دُنیا کو تلقین کی
تیرے اوراق ہیں عکسِ تردیدِ غم
تو نے دنیا کو درسِ محبت دیا
عشق کا تو صلہ مسجدِ قرطبہ

مردِ مومن وہ علامہ اقبال تھا
کتنا رنجور تھا کتنا بے حال تھا

سرزمیں پہ تیری اس نے دی تھی اذاں　　یہ تیری شان تیرا یہ اقبال تھا

ایسی عظمت خدا نے تجھے کی عطا

عشق کا تو صلہ مسجدِ قرطبہ

اس تقابلی مطالعہ سے علامہ اقبال کی انفرادیت پوری طرح نمایاں ہے۔ یہاں وہ مولانا الطاف حسین حالی سے آگے ہیں کیونکہ حالی کی مسدس کے جواب میں بیش تر شعرا نے بھی اپنے مسدس تخلیق کئے۔ مگر اقبال کے جواب میں کسی شاعر نے یہ جسارت نہ کی کہ ان کے مقابلہ یا جواب میں ان جیسی نظم "مسجدِ قرطبہ" کہہ سکتا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ علامہ اقبال جیسا سوزِ دروں پیدا کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ پھر بھی شعریت، شیرینی، ذہنی صلاحیت کے نقطۂ نظر سے ان شعرا نے صدق دلی سے علامہ اقبال کو خوبصورت خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اسے اقبال کے کلام کی آفاقیت کا ثمرہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

سید اختر الاسلام

۱۳۶، شاہ نتھن میرٹھ۔

(ایس۔ اے رحمٰن)

مکاتیبِ اقبال

پیش لفظ

علامہ اقبالؒ کے ۷۹ خطوں کا یہ مجموعہ طباعت کے لئے مکتوب الیہ کے دو صاحبزادوں، خان افتخار الدین احمد اور خان نفیس الدین احمد کے ادبی ذوق کا مرہون منت ہے۔ اس میں صرف دو خط ایسے شامل ہیں جو شیخ عطاء اللہ صاحب کے مرتبہ مجموعہ مکاتیبِ اقبال (اقبال نامہ) میں شائع ہو چکے ہیں۔ باقی غیر مطبوعہ ہیں۔ مکتوب الیہ خان نیاز الدین خاں مرحوم بستی دانشمندان (جالندھر) کے رئیس اور علم و ادب سے شغف رکھنے والے بزرگوں میں سے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنا کلام وقتاً فوقتاً بغرضِ اصلاح علامہ مرحوم کی خدمت میں بھیجتے رہتے تھے۔ ادبی موانست کے علاوہ ایک اور قدرِ مشترک کاتب و مکتوب الیہ میں یہ تھی کہ دونوں اعلیٰ نسل کے کبوتروں کے ناقد تھے۔ قارئین اس موضوع پر متعدد خطوط میں تصریحات پائیں گے۔

کسی مشہور و معروف علمی اور ادبی شخصیت کے نجی خطوط کی اشاعت ایک نازک مسئلہ ہے جس کے متعلق مختلف رائیں ہو سکتی ہیں۔ خود علامہ مرحوم اس بارے میں ایک مخصوص نظریہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں خان صاحب کو لکھتے ہیں۔

"عدیم الفرصتی تحریر میں ایک ایسا انداز پیدا کر دیتی ہے جس کو پرائیویٹ خطوط میں معاف کر سکتے ہیں۔ مگر اشاعت ان کی نظر ثانی کے بغیر نہ ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ میں پرائیویٹ خطوط کے طرزِ بیان میں خصوصیت کے ساتھ لاپرواہ ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ میرے خطوط اشاعت کے خیال سے محفوظ نہ رکھتے ہوں گے۔"

علامہ کی وفات کے بعد نظر ثانی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن شاید وہی بیساختگی اور بے تکلفی جس کی طرف علامہ مرحوم نے مندرجہ بالا اقتباس میں اشارہ کیا ہے، ایک محبوب شخصیت کے مبہم گوشوں کو بے نقاب کرنے میں از حد مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ مزید برآں اکثر خطوط میں علامہ مرحوم نے کسی نہ کسی اہم علمی یا ادبی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اور بڑے بڑے لطیف نکتے بیان کیے ہیں۔ جن سے اُن کے نظامِ فکر کی توضیح میں امداد لی جا سکتی ہے۔ اس لیے دل دادگانِ اقبال کو خان افتخار الدین احمد خاں اور خان نفیس الدین احمد خاں کا سپاس گزار ہونا چاہیئے۔ کہ انہوں نے اپنے والد مرحوم کے اس ادبی اور علمی ورثہ کی حفاظت کی اور تقسیم ملک کے بعد سینے سے لگا کر مشرقی پنجاب کی پرآشوب فضا سے نکال لائے اور اب اس کی طباعت کا اہتمام بزمِ اقبال کے سپرد کر کے اقبالیات کے ذخیرہ میں ایک بیش بہا اضافہ کر رہے ہیں۔

ایس۔ اے رحمٰن

تصدیق

میں نے اصل خطوط جو خان نیاز الدین خاں مرحوم کے صاحبزادوں کے قبضہ میں ہیں، دیکھ لئے ہیں، اور ان کا مقابلہ اس مجموعہ کی مشمولہ نقول سے بہ دقت نظر کر لیا ہے خط ۳۲ اُس نقل کی نقل ہے جو خان نفیس الدین احمد صاحب کے مسوّدہ پر موجود ہے۔ لیکن اصل خط کہیں پس و پیش ہو گیا ہے اور میری نظر سے نہیں گزر سکا۔ البتہ سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ یہ بھی علامہ مرحوم کے کسی خط کی صحیح نقل ہے۔ باقی خطوط مشمولہ مجموعۂ ہذا کی نسبت تصدیق کی جاتی ہے کہ وہ اصل خطوط کی صحیح نقول ہیں۔

ایس۔ اے رحمٰن

۸ جولائی ۱۹۵۴ء

مکاتیب اقبال

(۱)

لاہور ۱۹ جنوری ۱۹۱۶ء

مخدومی! السلام علیکم

الحمد للہ کہ آپ نے مثنوی کو پسند فرمایا۔ سید ولی اللہ شاہ صاحب کا رسالہ میں نے دیکھا ہے۔ یہی افلاطونیت جدید ہے جس کا اشارہ میں نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ فلسفۂ افلاطون کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے جس کو ایک پیرو PLOTINUS نے مذہب کی صورت میں پیش کیا۔ عیسائیت کی ابتدائی صدیوں میں رومی دنیا میں یہ مذہب نہایت مقبول تھا۔ اس کی آخری حامی ایک عورت تھی HYPATIA نام، جس کو عیسائیوں نے ہی مصر میں نہایت بیدردی سے قتل کرا دیا تھا۔ مسلمانوں میں یہ مذہب یہاں کے عیسائیوں کے تراجم کے ذریعہ سے پھیلا۔ اور رفتہ رفتہ مذہب اسلام کا ایک جزو بن گیا۔ میرے نزدیک یہ تعلیم

قطعاً غیر اسلامی ہے اور قرآنِ کریم کے فلسفہ سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ تصوّف کی عمارت اسی یونانی بیہودگی پر تعمیر کی گئی۔ والسلام

آپ کا خادم

محمد اقبال

(۲)

لاہور ۱۳ فروری ۱۹۱۶ء

مخدومی! السلام علیکم

والا نامہ ملا، مشکور فرمایا۔

میرا تو خیال تھا کہ فرصت کا وقت مثنوی کے دوسرے حصّہ کو دوں گا جو پہلے سے زیادہ ضروری ہے۔ مگر خواجہ حسن نظامی نے بحث کو چھیڑ کر توجہ اور طرف منعطف کر دی ہے۔ تصوّف کی تاریخ لکھ رہا ہوں۔ دو باب لکھ چکا ہوں یعنی منصور حلاج تک پانچ چار باب اور ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی علامہ ابن جوزی کی کتاب کا وہ حصہ بھی شائع کر دوں گا جو انہوں نے تصوّف پر لکھا ہے۔ گو ان کی ہر بات میرے نزدیک قابلِ تسلیم نہیں مگر اس سے اتنا تو ضرور معلوم ہو گا کہ علمائے محدثین اس کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں۔ ابن جوزی کی کتاب مطبع مجتبائی دہلی سے ملتی ہے مگر آپ اس پر روپیہ نہ خرچ کریں، کیونکہ اس کا ضروری حصہ میری تاریخ تصوّف کے ساتھ شائع ہو جائے گا۔ میں نے ترجمہ سے چھاپنے کی اجازت لے لی ہے۔

تصوف کے ادبیات کا وہ حصہ جو اخلاق و عمل سے تعلق رکھتا ہے نہایت قابل قدر ہے۔ کیونکہ اس کے پڑھنے سے طبیعت پر سوز و گداز کی حالت طاری ہوتی ہے۔ فلسفہ کا حصہ محض بے کار ہے اور بعض صورتوں میں میرے خیال میں تعلیم قرآن کے مخالف۔ اسی فلسفے نے متاخرین صوفیہ کی توجہ صور و اشکال غیبی کے مشاہدہ (کی) طرف کر دی اور ان کا نصب العین محض غیبی اشکال کا مشاہدہ بن گیا۔ حالانکہ اسلامی نکتہ خیال سے تزکیہ نفس کا مقصد محض ازدیاد یقین و استقامت ہے۔ اخلاقی اور عملی اعتبار سے متصوفین اسلامیہ کی حکایات و ملفوظات کا مطالعہ نہایت مفید ہے لیکن دین کی اصل حقیقت ائمہ اور علما کی کتابیں پڑھنے سے ہی کھلتی ہے اور آج کل زمانے کا اقتضا یہ ہے کہ علم دین حاصل کیا جائے اور اسلام کے علمی پہلو کو نہایت وضاحت سے پیش کیا جائے حضرات صوفیہ خود کہتے ہیں کہ شریعت ظاہر ہے اور تصوف باطن۔ لیکن اس پرآشوب زمانے میں وہ ظاہر جس کا باطن تصوف ہے، معرض خطر میں ہے۔ اگر ظاہر قائم نہ رہا تو اس کا باطن کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ مسلمانوں کی حالت آج بالکل ویسی ہے جیسے کہ اسلامی فتوحات ہندوستان کے وقت ہندوؤں کی تھی یا ان [illegible] کے اثر سے ہو گئی۔

ہندو قوم کو اس انقلاب کے زمانے میں منو کی شریعت موت سے بچا لیا۔ اپنی شریعت کی حفاظت کی وجہ سے ہی یہودی قوم اس وقت تک زندہ ہے ورنہ اگر فیلو (پہلا یہودی متصوف) قوم کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا تو آج یہ قوم

دیگر اقوام میں جذب ہو کر اپنی ہستی سے ہاتھ دھو چکی ہوتی۔ والسلام

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

خاکسار

محمد اقبال، لاہور

(۳)

ڈیئر خان صاحب! السلام علیکم

خط ابھی ملا ہے۔ آپ کا خط کسی غلطی سے حیدری صاحب کے لفافے میں پڑ گیا جس کا مجھے سخت افسوس ہے۔ میں اس وقت ظلمت میں تھا۔ حافظے پر اعتماد کر کے سب لفافے پہلے بند کر دیئے بعد میں ایڈریس لکھنے میں غلطی ہو گئی۔ میں نے حیدری صاحب کی خدمت میں لکھ دیا ہے کہ وہ خط واپس کر دیں۔ واپس آنے پر ارسال خدمت کروں گا۔ والسلام

آپ کا خادم

محمد اقبال

۳؍ مارچ ۱۹۱۶ء

(۴)

لاہور، ۲۶ مارچ ۱۹۱۶ء

مخدومی خان صاحب! السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ کئی دنوں سے آیا رکھا ہے میں عدیم الفرصت تھا اس واسطے جواب عرض نہ کر سکا۔

الحمد للہ جالندھر کے کتب خانے کے لئے اجازت ہو گئی۔ میں فرصت کے دنوں سے جناب کو مطلع کروں گا۔

اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

آپ کا خادم

محمد اقبال، لاہور

(۵)

لاہور، ۸ جولائی ۱۹۱۶ء

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے۔ الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ سراج الدین صاحب کے دونوں مضامین جو آپ کی نظر سے گذرے بہت اچھے ہیں ان کا تیسرا مضمون "خودی اور رہبانیت" پر حال ہی میں شائع ہوا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔ معلوم ہوتا ہے میرا مضمون "علم ظاہر و علم باطن" جو وکیل میں شائع ہوا ہے آپ کی نظر سے نہیں گذرا۔ اسے بھی پڑھیئے۔ ایک اور مضمون لکھ رہا ہوں جو بالکل نرالا ہے۔ غالباً آج تک ایسا مضمون نہیں لکھا گیا جن علما نے تصوف وجودیہ کی مخالفت کی ہے ان کی توجہ کبھی اس طرف نہیں ہوئی۔ بہر حال آپ دیکھیں گے تو داد دیں گے۔

ہاں کتابیں نہیں ملتیں، بڑی دقت ہے۔ شیخ روزبہان بقلی کی شرح شطحیات ایک عجیب و غریب کتاب ہے اس میں صوفیا وجودیہ نے جو خلاف شرع باتیں کہی ہیں۔ ان کی شرح ہے۔ اگر یہ رسالہ ہاتھ آجائے تو تصوف کے بہت سے مسائل پر اس سے روشنی پڑے گی۔ مگر باوجود تلاش کے نہیں دستیاب ہو سکا۔ سنا ہے کہ لاہر پور (اودھ) میں ایک سجادہ ہے۔ یہاں کوئی بزرگ قلندر صاحب گذرے ہیں جنہوں نے محی الدین ابن عربی کی فتوحات کی تردید میں ایک مبسوط کتاب فارسی زبان میں لکھی ہے۔ جو اب تک ان کے جانشینوں کے پاس محفوظ ہے۔ میں نے موجودہ سجادہ نشین کی خدمت میں خط لکھوایا ہے۔ دیکھیں کیا جواب ملتا ہے۔

کپورتھلے اور جالندھر انشاء اللہ ضرور آؤں گا۔ عجب نہیں کہ ان تعطیلوں میں موقع مل جائے۔ چند روز کے لئے شملہ جاؤں گا، وہاں سے دہلی ہوتے ہوئے جالندھر اور کپورتھلہ کی سیر کا موقع مل سکتا ہے۔ بہر حال یہ قصد ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پورا کرنے کی توفیق عطا کرے۔ لاہور میں بارش مطلق نہیں ہوئی۔ لوگ تڑپ رہے ہیں۔ تین روزے رکھے تھے کہ دردگردہ کے دورہ کی ابتدا محسوس ہوئی۔ دو روز سے روزہ سے بھی محروم ہوں۔ والسلام

اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال۔ لاہور

(۶)

لاہور، ۱۱ ستمبر ۱۹۱۶ء

مخدومی خان صاحب! السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے میرا ارادہ تو شملہ جانے کا تھا۔ نواب ذوالفقار علی خانصاحب سے وعدہ کیا تھا اور ان کے خطوط اب تک بھی آرہے ہیں مگر بھائی صاحب نے مجھ سے وعدہ لے لیا کہ اگست کا سارا مہینہ سیالکوٹ میں قیام کروں۔ سو میں بمع اہل (و) عیال کے ۲۹ اگست تک وہاں رہا۔ وہاں سے ستمبر شروع ہونے سے پہلے اس واسطے آگیا کہ اگر مولوی احمد دین وکیل ہمراہ ہو گئے تو ستمبر کا مہینہ کشمیر میں بسر کروں گا۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے پہلے کشمیر چلے گئے ہیں۔ کل منشی سراج الدین میر منشی ریزیڈنسی کا خط آیا ہے کہ چند روز کے لئے چلے آؤ اور نیز یہ کہ چودھری شہاب الدین کو تار دیا ہے کہ وہ تم کو ہمراہ لے کر جلد آئیں۔ چودھری صاحب غالباً ڈلہوزی میں ہیں۔ ان کے انتظار میں ہوں کہ وہ آئیں تو ان کے ہمراہ چند روز وہیں بسر کر آؤں۔ انشاء اللہ جالندھر ضرور حاضر ہوں گا۔ میاں مبارک علی صاحب کا متبنّٰی میرا موکل رہ چکا ہے۔ اگر کتابیں اُس کے پاس باقی ہوئیں تو ان کا دیکھنا کچھ مشکل نہیں اور اگر مشکل بھی ہو تو آپ کی موجودگی میں کون سی مشکل ہے جو حل نہ ہو۔

افسوس ہے کہ اگست کے مہینے میں تصوّف کی تاریخ پر کچھ نہیں لکھ سکا، البتہ مثنوی کے دوسرے حصے کے بہت سے اشعار لکھے گئے۔ یعنی آدھی مثنوی لکھی گئی۔

کیا عجب کہ باقی بھی جلد تمام ہو جائے۔ اور دوسرے حصے کی اشاعت بھی جلد ہو جائے۔ پہلے حصے کی دوسری ایڈیشن کا کاغذ کل خرید کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے مغربی ہند کے ملاحدہ کی رد اور اصلاح کے لئے مامور کیا تھا اور یہ کام انہوں نے نہایت خوبی سے کیا ہے۔ ان کی کتاب فضیلت الشیخین بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے آخری حصہ میں تصوف پر انہوں نے خوب بحث کی ہے۔ امام غزالی علیہ الرحمتہ کی نسبت یہ فیصلہ کرنا کہ وہ ہمہ اوست یا ہمہ از وست کے قائل تھے، نہایت مشکل ہے۔ وہ فلسفی تھے اور دونوں طرفوں کی مشکلات کو خوب سمجھتے تھے۔ حال کے حکماء میں جرمنی کا مشہور فلسفی لاٹسا بالکل دوسرا غزالی ہے۔ یعنی خدا کے سمیع و بصیر ہستی ہونے کا بھی قائل ہے اور ساتھ اس کے اس بات کا بھی قائل ہے کہ وہ ہستی ہر شئے کی عین ہے۔ میرے نزدیک منطقی اعتبار سے کوئی آدمی ایک ہی وقت میں ان دونوں شقوں کا قائل نہیں ہو سکتا۔ اسی واسطے لاٹسا کا فلسفہ یورپ میں مقبول نہ ہوا۔ گو اس کی تعلیم اس قسم کی تھی کہ وحدت الشہود اور وحدت الوجود دونوں کی طرف میلان رکھنے والی طبائع کے لئے موزوں تھا۔ مگر میرا مذہب تو یہ ہے کہ یہ سارے مباحث مذہب کا مفہوم غلط سمجھنے سے پیدا ہوئے ہیں۔ مذہب کا مقصود عمل ہے نہ (کہ) انسان کے عقلی اور دماغی تقاضاؤں کو پورا کرنا۔ اسی واسطے قرآن شریف کہتا ہے، وَمَا اُوتِیتُم مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیلًا۔ اگر مذہب کا مقصود عقلی تقاضاؤں کو پورا کرنا ہو بھی (جیسا کہ ہنود کے رشیوں اور فلسفیوں نے خیال کیا ہے) تو زمانہ حال کی خصوصیات

کے اعتبار سے اس کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ اس وقت وہی قوم محفوظ رہے گی جو اپنی علمی روایات پر قائم رہ سکے گی۔

"اس دور میں سب مٹ جائیں گے، ہاں باقی وہ رہ جائے گا
جو اپنی راہ پہ قائم ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے"

خادم

محمد اقبال

(۷)

لاہور، ۷ فروری ۱۹۱۷ء

مخدومی! السلام علیکم

افسوس کہ مثنوی کا دوسرا حصہ ابھی تیار نہیں ہو سکا۔ کل کچھ فرصت مل گئی تھی۔ فقط کا وہ مسئلہ نظم کیا جس کی رو سے مسلمانوں پر اس دشمن پر حملہ کرنا حرام ہے جو صلح کی امید میں اپنے حصار وغیرہ گرا دے۔ اس مسئلے کا ذکر کر کے اس کی حقیقت اور فلسفہ لکھا ہے کہ شرع نے کیوں ایسا حکم دیا ہے عجیب عجیب باتیں ذہن میں آتی ہیں مگر قلب کو یکسوئی میسر نہیں۔

آپ نے سفارش ملتوی کی۔ خوب کیا۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو یہی کرتا۔

مولوی اشرف علی جہاں تک مجھے معلوم ہے وحدت الوجود کے مسئلے سے

اختلاف رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی کتاب عمدہ ہوگی۔

انشاء اللہ کپورتھلہ اور جالندھر جانے کے لئے وقت نکالوں گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

آپ کا خادم

محمد اقبال، لاہور

(۸)

لاہور، ۲ مارچ ۱۹۱۷ء

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ملا، جسے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ الحمد للہ کہ آپ کو وہ غزل پسند ہوئی۔ بہت عرصہ ہوا لکھی گئی تھی۔ معلوم نہیں کس نے اسے مخزن میں اشاعت کے لئے بھیج دیا۔

میں لاہور کے ہجوم میں رہتا ہوں مگر زندگی تنہائی کی بسر کرتا ہوں۔ مشاغل ضروری سے فارغ ہوا تو قرآن یا عالمِ تخیل میں قرونِ اولیٰ کی سیر، مگر خیال کیجیے جس زمانے کا تخیل اس قدر حسین و جمیل و روح افزا ہے، وہ زمانہ خود کیسا ہوگا!

خوشا وہ عہد کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ روز کہ دیدار عام تھا اس کا

مثنوی کا دوسرا حصہ جس کا نام "رموزِ بیخودی" ہوگا، انشاء اللہ۔ اس

سال کے ختم ہونے سے پیشتر ختم ہو جائے گا۔ آج کل لاہور میں ہوں اور مولینا گرامی جالندھری تشریف فرما ہیں اور میرے ہاں قیام پذیر ہیں۔ خوب شعر بازی رہتی ہے، کل ہوشیار پور واپس جائیں گے۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

(۹)

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مل گیا ہے۔ جو شعر میں نے کسی پہلے خط میں لکھا تھا وہ ایک نظم کا، جو کئی سال ہوئے میں نے عشقِ بلال پر لکھی تھی، آخری شعر ہے۔ باقی اشعار ذہن میں محفوظ نہیں رہے مخزن کے پرانے نمبر اگر آپ کے پاس ہیں تو ان میں مل جائے گی، میں بھی تلاش کروں گا مل گئی تو حاضرِ خدمت کر دوں گا۔

گرامی صاحب سنا ہے جالندھر آنے والے ہیں۔ مجھ کو بھی طلب کیا ہے۔ مگر میں کئی دنوں سے بوجہ دورۂ دردِ گردہ کے مضمحل ہوں، اس واسطے معذور ہوں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

آج کل موسم تبدیل ہو رہا ہے۔ ہر بات میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

والسلام۔ مخلص محمد اقبال

۲۱ مارچ ۱۹۱۷ء

(۱۰)

لاہور، ۲۷ جون ۱۹۱۷ء

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا، جس کو پڑھ کر بہت مسرت ہوئی۔ الحمدللہ کہ آپ بخیریت ہیں اور مولوی گرامی صاحب بھی اب آلام و افکار سے آزاد ہیں عرصہ ہوا میں نے انھیں خط لکھا تھا۔ مگر ان کے لئے خط کا جواب دینا ایسا ہی ناممکن ہے جیسا روس کا موجودہ حالات میں جرمنی سے لڑ سکنا۔ بہرحال یہ سن کر خوشی ہوئی کہ وہ جالندھر آنے کا قصد رکھتے ہیں۔ ان کی صحبت سے زیادہ پُرلطف چیز اور کون سی ہے۔ اگر ممکن ہو سکتا تو میں یہ ایام بھی ہوشیار پور میں ان کی صحبت میں گزارتا۔ میری نسبت وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں محبت کا مبالغہ شامل ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ محبت محبوب کا صحیح اندازہ کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔

مگر مولوی گرامی صاحب کا وعدہ وہی ہے جس کی نسبت مرزا غالب مرحوم عرصہ دراز ہوا کہہ گئے ہیں:۔

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا (الخ)

مجھے یہ اندیشہ (سا ہے) کہ اگر میں ان سے ملنے کے لئے جالندھر آیا تو پھر وہ لاہور نہ آئیں گے۔ خیر یہ باتیں بعد میں سوچنے کی ہیں۔ پہلے یہ دیکھنا ہے کہ وہ جالندھر آتے بھی ہیں یا نہیں۔

واقعی آم درد گردہ کے مریض کے لئے اچھا ہے اور مجھ کو بھی اس سے بہت محبت ہے۔
کھانے کی چیزوں میں صرف یہی ایک چیز ہے جس کے لئے میرے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ باقی چیزوں کے لئے خواہش نہیں ہوتی یہاں تک کہ روزمرہ کا کھانا بھی عادت کے طور پر کھاتا ہوں باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

ہاں آموں پر ایک لطیفہ یاد آگیا گذشتہ سال مولینا اکبر نے مجھے لنگڑا آم بھیجا تھا میں نے پارسل کی رسید اس طرح لکھی:۔

اثر تیرے یہ اعجازِ مسیحائی کا ہے اکبرؔ!
الٰہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا!

رموزِ بیخودی کو میں اپنے خیال میں ختم کر چکا تھا مگر پرسوں معلوم ہوا کہ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ترتیب مضامین ختم کرتے وقت یہ بات ذہن میں آئی کہ ابھی دو تین ضروری مضامین باقی ہیں یعنی قرآن اور بیت الحرام کا مفہوم و مقصود حیاتِ ملیہ اسلامیہ میں کیا ہے۔ ان مضامین کے لکھ چکنے کے بعد اس حصۂ مثنوی کو ختم سمجھ لینا چاہیئے۔ مگر ایسے ایسے مطالب ذہن میں آئے ہیں کہ خود مسلمانوں کے لئے موجب حیرت و مسرت ہوں گے کیونکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے ملتِ اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ نئے سکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف جھونپڑا ہے قومیت ... کے

اصول حقہ صرف اسلام نے ہی بتائے ہیں جن کی پختگی اور پائیداری مرور ایام و اعصاد سے متأثر نہیں ہو سکتی۔ والسلام

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

خاکسار

محمد اقبال

(۱۱)

لاہور ۴ر نومبر ۱۹۱۷ء

مخدومی جناب خان صاحب! السلام علیکم

آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے الحمد للہ کہ خیریت ہے۔

گرامی صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ محرم میں تشریف لائیں گے مگر الکوفی لا یوفی اب معلوم نہیں کہاں تشریف رکھتے ہیں عرصہ سے ان کا خط بھی نہیں آیا۔

پنڈت چھجو رام صاحب کی رائے سے کوئی تعجب مجھے نہیں ہوا ہر شخص ہر کتاب کو اپنے خیالات کی روشنی میں پڑھتا ہے اور اس کے مضامین سے وہی نتائج نکالتا ہے جن کی اس کی دماغی ترتیب مقتضی ہوتی ہے۔ سیاسیات مسلمانوں میں کوئی علیحدہ شئے نہیں بلکہ خالص مذہبی نکتۂ خیال سے کچھ شئے ہی نہیں اور اگر کچھ ہے تو مذہب کی لونڈی ہے۔ کعبہ آباد است الخ والا مصرع اس وقت لکھا گیا تھا جب موجودہ حالات کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

دوسرا حصہ انشاء اللہ اس سال سے پہلے ختم ہو جائے گا۔ صرف چند اشعار کی کشر باقی ہے اگر آج وہ اشعار لکھے جائیں تو ایک ہفتہ کے اندر نقل کر کے کتاب مطبع میں دی جا سکتی ہے مگر میں انتظار میں ہوں کہ وہ اشعار آئیں تو ان کو مثنوی میں داخل کر دوں دوسرے حصے کے مضامین سے پہلے حصہ پر کافی روشنی پڑے گی اور بہت سی تشریحات جو پہلے حصہ کے اشعار کی کی جا رہی ہے خود بخود غلط ہو جائے گی۔ اسلامی NATIONALISM کی حقیقت اس سے واضح ہو گی اور یہ کہنے میں کوئی مبالغہ یا خود ستائی نہیں کہ اس رنگ کی کوئی نظم یا نثر اسلامی لٹریچر میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

گرامی صاحب تو امام غائب ہو گئے معلوم نہیں اس غیبت صغریٰ کا زمانہ کب ختم ہو گا۔

خاکسار

محمد اقبال

(۱۲)

لاہور ۲۷ نومبر ۱۹۱۷ء

مخدومی خان صاحب! السلام علیکم

مثنوی ختم ہو گئی اسے نقل کر رہا ہوں چند روز کے بعد پریس میں دے دی

جائے گی۔ مولوی گرامی نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کی تقریظ کے بغیر مثنوی شائع نہ ہو۔ مہربانی کر کے ان کی خدمت میں عرض کریں کہ وہ تقریظ کے اشعار ارسال فرمائیں مجھے ان کا پتہ معلوم نہیں ورنہ آپ کو پیغام بری کی زحمت نہ دیتا اور ان کو براہِ راست خط لکھتا۔

پندرہ روز کے اندر اندر تقریظ مل جانی چاہیئے۔ والسلام

اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

خاکسار

محمد اقبال

(۱۳)

لاہور ۲۷ دسمبر ۱۹۱۷ء

مخدومی جناب خان صاحب! السلام علیکم

نوازش نامہ مل گیا تھا کیا کہیئے دل کو آپ سے اُنس ہے مگر جالندھر لاہور سے دور ہے تاہم تعطیلوں کی وجہ سے ضرور حاضر ہوتا مگر دقت یہ آپڑی کہ میرے والد مکرم پرسوں لاہور تشریف لاتے ہیں۔ کل شیخ عمر بخش صاحب سے ملاقات ہوئی تھی ان کی معرفت بھی یہی پیغام ارسال کر چکا ہوں۔ گاؤں کی زندگی واقعی قابلِ رشک ہے اور اگر جالندھر کے افغانوں میں کچھ اپنے قومی و ملی خصائص ابھی تک محفوظ ہیں تو اسی زندگی کی وجہ سے، مگر گنّے کی کھیر سے یارانِ ہمدم کی صحبتِ شیریں تو ہے اور اس میں

صرف اس قدر نقص ہے کہ ہر وقت میسّر نہیں آتی۔

مثنوی کل سنسر کے محکمے سے واپس آگئی ہے۔ انشاء اللہ آج کاتب کے حوالے کی جائے گی۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ گرامی سے ملاقات ہو تو سلام کہہ دیجیے گا۔ ان کا کوئی خط مجھے نہیں ملا۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ وہ بڑے مقدمہ باز ہو گئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ کسی دیوانی مقدمے میں انہوں نے جواب دعویٰ نظم میں دیا ہے۔

والسلام

مخلص

محمد اقبال، لاہور

(۱۴)

۹ مارچ ۱۹۱۸ء

مخدومی خان صاحب! السلام علیکم

فقیر صاحب کا ذکر شیخ صاحب سے سُنا تھا، مجھے بھی ان کے دیکھنے کا اشتیاق ہے۔ مولوی گرامی صاحب کی بیوی کا خط دربارہ گواہی مجھے آیا تھا۔ وہ مجھ سے قبضۂ مکان کی شہادت دلوانا چاہتے ہیں مگر میری شہادت ان کے لئے کچھ مفید نہیں ہو سکتی میں نے ان کو مفصّل لکھ دیا ہے۔ معلوم نہیں میرا خط ان کو ملا یا نہ ملا۔

چند روز میں ایم۔ اے کا زبانی امتحان لینے کے لئے الٰہ آباد جانے والا

ہوں اور یہ تجنی میں نے اس واسطے قبول کرلی کہ مولینا اکبر کی زیارت کا بہانہ ہو جائے گا۔ خواجہ دل محمد صاحب والا مضمون میری نظر سے نہیں گذرا اور نہ ان کی نظم دیکھنے میں آئی۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص

محمد اقبال، لاہور

(۱۵)

مکرمی! السلام علیکم

میں الٰہ آباد جانے والا تھا مگر مولینا اکبر کے خط سے معلوم ہوا کہ وہاں پلیگ زوروں پر ہے۔ والد مکرم نے جو چند روز ہوئے یہاں تھے یہ خط دیکھ کر مجھے الٰہ آباد جانے سے روک دیا۔ دہلی جانے کا قصد تھا مگر وہاں بھی نہ گیا۔ نواب صاحب جاتی دفعہ مجھ سے کہہ گئے تھے کہ ۲۲ مارچ کو واپس لاہور آجائیں گے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ کسی اور جگہ جانے والے نہیں ہیں۔ ۲۸ مارچ کو ان کے ایک مقدمہ کی تاریخ لدھیانہ میں ہے کمیشن مقرر کردہ عدالت نے خود ان کو بیان کے لئے طلب کیا ہے ممکن ہے کہ وہ اس تاریخ کو لدھیانے جائیں۔ باقی حالات مجھے معلوم نہیں۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ میں خدا کے فضل و کرم سے بخیریت ہوں۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

۲۰ مارچ ۱۹۱۸ء

(۱۶)

مخدومی! آپ کا پوسٹ کارڈ ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ کچھ مضائقہ نہیں اگر شیخ عمر بخش صاحب کبوتر نہیں لائے میں چاہتا ہوں کہ کبوتر یہاں اکتوبر میں آئیں اس سے پہلے نہ آئیں میں چند روز تک سیالکوٹ جانے والا ہوں۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کروں گا ستمبر کے آخر میں شاید یہاں آنا ہوگا۔ امیر الدین خاں کو بھی لکھنے کی ضرورت نہیں۔ باقی جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کے متعلق کیا عرض کروں آپ کو میری افتاد طبیعت سے بخوبی آگاہی ہے۔

گرامی صاحب نے شاید ملک الموت کو کوئی رباعی کہہ کر ٹال دیا ہے۔ اور کیا تعجب کہ ہجو کہنے کی دھمکی دے دی ہو۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

۲۶ جولائی ۱۹۱۸ء

(۱۷)

لاہور ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۸ء

مخدوم و مکرم جناب خان صاحب! السلام علیکم

میں ۳۰ ستمبر کو لاہور واپس آگیا تھا اور اب کہیں جانے کا قصد نہیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بخیریت ہیں۔ گرامی صاحب سُنا ہے لاہور آنے والے ہیں میں نے آج ایک عریضہ ان کی خدمت میں لکھا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بھوپالی نے ایک مضمون مثنویوں پر انگریزی میں لکھا ہے۔ جو رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ میں شائع ہوا ہے اگر آپ کی نظر سے نہ گذرا ہو تو لکھیئے کہ اس کی ایک کاپی بھیج دوں اس کی کاپیاں ایسٹ اینڈ ویسٹ والوں نے علیحدہ بھی شائع کی ہیں اور صاحبِ مضمون نے چند کاپیاں مجھے بھیج دی تھیں۔

کبوتروں کے لئے شکریہ قبول کیجئے۔ بخار کا اب تک تو حملہ مجھ پر نہیں ہوا۔ کونین کا استعمال میں نے کبھی نہیں کیا سوائے حالتِ بخار کے اور وہ بھی نہایت کراہت کے ساتھ۔

اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

(۱۸)

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے الحمد للہ کہ آپ کے ہاں تا حال خیریت ہے۔ یہاں بھی خدا کے فضل و کرم سے اس وقت تک خیریت ہے۔ لاہور میں وبا کی شدت بہت ہے یہاں تک کہ گورکن بھی میسر نہیں آتے۔ اللہ تعالیٰ سب جگہ اپنا فضل کرے اس بیماری کے جراثیم تمام دنیا کی فضا میں پائے جاتے ہیں اور غضب یہ ہے کہ ابھی اس کی تشخیص سے عاری ہیں۔ دوائی سے اس کا مقابلہ نہیں ہو سکتا کہ دوائی میسر نہیں ہوتی۔ دار چینی کا استعمال کہتے ہیں مفید ہے۔ قہوہ دو چار دفعہ دن میں پینا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر رحم فرمائے۔ والسلام

آپ کا مخلص

محمد اقبال

لاہور ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۸ء

(۱۹)

لاہور ۱۲ نومبر ۱۹۱۸ء

مخدومی خان صاحب! السلام علیکم

کبوتروں کے دو جوڑے مل گئے۔ اور آج آپ کا والا نامہ بھی مل گیا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ انشاء اللہ ان کو حفاظت سے رکھا جائے گا۔ اور اگر کبھی اپنے

۱۹۱۸ء میں انفلوئنزا کی وبا پھیلی تھی اور مرگِ انبوہ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

سے جدا کرنے کی ضرورت ہوئی تو آپ کی خدمت میں انہیں واپس بھیج دیا جائے گا۔
اس عطیئے کے لئے آپ کا شکریہ ہے اور مزید شکریہ اس وقت ادا کروں گا جب ان
کے جوہر مجھ پر آشکار ہو جائیں گے۔

گرامی صاحب بیماری کے خوف سے سُنا ہے خانہ نشین ہیں ان کی جگہ ان کا
خط آیا تھا ان کے خود آنے کی یہاں کسی کو توقع نہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں خدا کا فضل و
کرم ہے لاہور میں اب بیماری کا نہ نہیں رہا بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ مرض دور ہو گیا۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

(۲۰)

لاہور ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء

ڈیئر خانصاحب! السلام علیکم

والا نامہ ملا جس کے لئے سراپا سپاس ہوں مارچ میں آپ لاہور تشریف
لا دیں تو مولوی گرامی صاحب کو بھی ہمراہ لائیں وہ ایک مدت سے وعدہ کر رہے ہیں
مگر کبھی ایفا نہیں کرتے۔ کیا خوب! آپ نے سُنا کہ اقبال نے وکالت چھوڑ دی شاید
یہ بھی کسی نے کہا ہو کہ کسی جنگل میں کٹیا بنا لی ہے اور ہُو ہُو کے نعرے بلند کر رہا ہے!
بہر حال روزی کے لئے سب ڈھنگ ہیں۔ بیرسٹری چھوڑے گا تو کوئی اور ڈھنگ

اختیار کرنا ہوگا۔ کسی نے خوب گپ اڑائی ہے معلوم نہیں اس کا مقصد اس خرافات سے کیا تھا۔؟

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ امید کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال، لاہور

(۲۱)

لاہور ۵ فروری ۱۹۱۹ء

مخدومی! السلام علیکم

الحمد للہ کہ گرامی صاحب بستی میں تشریف لائے اور آپ کی آرزو پوری ہوئی۔ کاش میں بھی وہاں موجود ہوتا اور ان کے تازہ افکار سے بہرہ اندوز ہو کر لذتِ روحانی حاصل کرتا۔ آخر فروری یا ابتدائے مارچ میں دہلی جانے کا قصد ہے۔ ذوالفقار علی خان صاحب سے اس کا وعدہ ہو چکا ہے۔ لاہور سے دہلی جاتے ہوئے یا وہاں سے واپس آتے ہوئے انشاء اللہ جالندھر ٹھہروں گا اور آپ سے اور گرامی صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کروں گا۔ ہاں گرامی صاحب نے مصرع خوب لگایا۔ مسلمان کے پاس سوائے خدا کے اور کیا ہے انشاء اللہ اس کا حال عنقریب روشن ہو جائے گا۔ آپ نے سنا ہے:۔ الیس اللہ بکاف عبدہ (کیا اللہ اپنے

بندے کے لئے کافی نہیں ہے، زیادہ کیا عرض کروں۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔
مولینا گرامی کی خدمت میں آداب عرض ہو۔ یہ شعر بھی ان کی خدمت میں پیش کیجئے۔
اور میری طرف سے عرض کیجئے کہ بنظرِ اصلاح ملاحظہ فرمائیں:۔

ضبط از دل من بر دو فرو ریخت بجانم
آں نکتہ کہ با مومن و کافر نتواں گفت

مخلص

محمد اقبال، لاہور

(۲۲)

لاہور، ۱۱ فروری ۱۹۱۹ء

مخدومی جناب خان صاحب! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ
والا نامہ مل گیا ہے۔ گرامی صاحب، امید ہے، بخیریت ہوں گے۔ آپ کے
دوسرے مصرع میں ایک بہت بڑے شاعر سے توارد ہو گیا۔ ان کا شعر ہے۔

آں چیز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

مگر مصرع جو قابل مصرع لگانے کے ہے یہ ہے۔

ایں سرِ خلیل است با آذر نتواں گفت

گرامی صاحب کی خدمت میں پیش کیجئے۔ یہ مصرع کارڈ ہذا لکھتے ہوئے

خیال میں آیا، مگر دوسرے مصرع کے لئے فکر کرنے کی فرصت نہیں۔ فرصت کے اوقات میں انشاء اللہ فکر کروں گا۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام،

گرامی صاحب کی خدمت میں سلام۔

مخلص

محمد اقبال

(۲۳)

لاہور، ۱۴ فروری ۱۹۱۹ء

مخدومی! السلام علیکم!

نوازش نامہ مل گیا ہے۔ اس سے پہلے ایک کارڈ لکھ چکا تھا، امید کہ پہنچ کر ملاحظۂ عالی سے گذرا ہوگا۔

مولینا گرامی کے اشعار جواہر ریزے ہیں! سبحان اللہ! ان کی خدمت میں عرض کیجیے کہ برائے خدا غزل پوری کریں۔ آپ کے اشعار سے مجھے تعجب ہوا۔ معلوم نہ تھا کہ آپ چھپے رستم ہیں۔ کیوں نہ ہو، آخر مولانا گرامی کے ہم وطن ہیں۔

وافر اور ظاہر قوافی اس غزل میں درست نہیں۔ آپ نے شاید کافر بکسر فا کا خیال کیا ہوگا، مگر غزل میں کافر بفتح فا ہے اور یہ لفظ بفتح فا بھی اساتذہ نے لکھا ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ کیا اچھا ہو،

مولینا گرامی ہفتہ دو ہفتہ کے لئے لاہور آجائیں اور یہاں سے اکھٹے دہلی چلیں۔
محل حکیم محمد اجمل خانصاحب بھی آنے والے ہیں۔ ذوالفقار علی خانصاحب کے ہاں
ان کا قیام ہوگا۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال، لاہور

(۲۴)

مخدومی جناب خان صاحب! السلام علیکم

نوازش نامہ مل گیا جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ دہلی گیا تھا، مگر جو دن
جالندھر کے لئے رکھا تھا وہ وہیں دہلی نے لے لیا۔ حکیم صاحب نے باصرار
ٹھہرالیا۔ اس واسطے آپ کی خدمت میں نہ ٹھہر سکا کہ ۷ مارچ کو کچہری میں کام
تھا۔ انشاءاللہ آپ سے جلد ملاقات ہوگی۔ گرامی کی صحبتِ نیاز کو نظامی بنا
ڈالے گی۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ گرامی صاحب کی تپ کوئی نئی بات نہیں۔
شاعروں کو قدرتی تپ ہوتی ہے۔ والسلام

محمد اقبال، لاہور

۱۳ مارچ ۱۹۱۹ء

(۲۵)

۲۱ مارچ ۱۹۱۹ء

مخدومی خان صاحب! السلام علیکم

والا نامہ مل گیا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ الحمدللہ کہ مولینا گرامی اور آپ مع الخیر ہیں۔

دونوں شعروں کا مضمون لاجواب ہے، مگر بندش کھٹکتی ہے۔ پہلے شعر میں "فاقہ نشیں" کھٹکتا ہے اور "ایں جا" حشو معلوم ہوتا ہے۔ اگر پہلا مصرع یوں ہوتا "قیس می گفت کہ از جام بلوریں رستم" تو غالباً "ایں جا" کی حشویت کسی قدر کم ہو جاتی، گو مطلق دور نہ ہوتی۔ دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں بھی "ایں جا" حشو معلوم ہوتا ہے، بالخصوص جب کہ "بردر میکدہ" کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ ان پر نظر ثانی فرمائیے۔ میں نے جام اور خرام بھی لکھے تھے:

نشہ از حال بگیریم دگذشتیم زقال
نکتۂ فلسفہ دردِ تہ جام است اینجا

اے کہ تو پاس غلط کردۂ خود می داری
آنچہ پیش تو سکون است وخرام است اینجا

اور "لب بام" اس طرح لکھا تھا:-

ما دریں رہ نفس دہر بر انداختہ ایم
آفتاب سحر او لب بام است اینجا

جب دو آدمیوں کا دوڑنے میں مقابلہ ہو اور ایک تھک کر رہ جائے اور اس کا دم پھول جائے تو فارسی میں کہتے ہیں "نفسِ او بر انداختہ است" جسے پنجابی میں کہتے ہیں "دموں کڈھ دینا" مقصود یہ ہے کہ ہم اس قدر تیز رفتار ہیں۔ کہ روزگار کو بھی ہم نے نفس برانداختہ کر دیا ہے، یہاں تک کہ اس کی صبح کا آفتاب ہمارے ہاں لبِ بام ہے۔ اس نظم کا عنوان تھا "دنیائے عمل" اور اسی مطلب کے یہ سب اشعار تھے۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ جالندھر کے اناغنہ میں ذوقِ سخن باقی ہے اور یہ قوم ابھی اپنے بزرگوں کی روایات کو زندہ رکھتی ہے۔ افسوس کہ میں پشتو نہیں جانتا، ورنہ سرحد کی مارشل شاعری کو اردو یا فارسی لباس پہنانے کی کوشش کرتا۔

مولینا گرامی کی خدمت میں عرض کیجئے کہ اگر لاہور تشریف لانے کا قصد ہو تو ابھی آنا چاہیئے، ورنہ پھر گرمی بڑھ جائے گی اور لطفِ صحبت خاک نہ رہے گا۔ کل نواب ذوالفقار علی خان صاحب بھی دہلی سے آنے والے ہیں، وہ مولینا گرامی سے ملنے کے بڑے آرزومند ہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ شیخ صاحب کو آپ کا پیغام دے دوں گا۔

مخلص

محمد اقبال، لاہور

(۲۶)

ڈیر خان صاحب! اسلام علیکم

والا نامہ ابھی ملا ہے، جس کے لئے شکر گذار ہوں۔ خدا کے فضل و کرم سے بالکل تندرست ہوں اور دست بدعا ہوں کہ آپ مع جملہ اقربا و احباب کے تندرست ہوں۔ آپ نے اخباروں میں دیکھا ہوگا کہ لاہور میں مارشل لا کا اجرا کر دیا گیا ہے۔ حکام اس بات پر مجبور ہوتے ہیں مگر امن پسند لوگوں کے لئے اس میں کوئی اندیشہ نہیں۔ اُمید کہ مولینا گرامی مع الخیر ہوں گے۔ اُن کی خدمت میں آداب عرض کیجئے۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال: لاہور

۲۰ اپریل ۱۹۱۹ء

(۲۷)

مخدومی خان صاحب! السلام علیکم۔ مجھے یقین تو ہے اور اس کا اظہار بھی کسی پہلے خط میں کر چکا ہوں کہ مولینا گرامی آپ کو شاعر بنا چھوڑیں گے۔ یہ غزل انھیں ضرور دکھائیے:-

شیخ در عہدِ جوانی بہ گل و مل می زیست

وعظ فرما شدہ آں روز کہ از کار شدہ

خوب شعر ہے۔ تھوڑی مشق کے بعد معمولی نقص جواب پائے جاتے ہیں۔

دور ہو جائیں گے۔

کیا مولوی گرامی لاہور آنے کا بھی قصد رکھتے ہیں یا نہ؟ معلوم ہوتا ہے خوفزدہ ہو گئے، مگر خوف کی کوئی بات نہیں۔ کل ایک شعر لکھا تھا، مولوی صاحب کی خدمت میں عرض کیجئے۔

برق را ایں بجگری زند، آں رام کند
عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دارتر است

مخلص

۱۹ رمئی، ۱۹۱۹ء

محمد اقبال۔ لاہور

(۲۸)

لاہور، ۳۰ راگست ۱۹۱۹ء

مخدومی خان صاحب! السلام علیکم

کئی روز ہوئے، آپ کا والا نامہ ملا تھا، مگر میں ان دنوں پیچش میں مبتلا تھا۔ جواب نہ لکھ سکا۔ آج میز پر تلاش کرتا ہوں تو وہ خط ندارد ہے۔ تعجب ہے کہ آپ غزل تو مولوی گرامی صاحب کی صحبت میں لکھیں اور اصلاح کے لئے مجھ سے ارشاد ہو۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اصفہان میں رہنا اور سرمہ ہندوستان سے خرید کرنا۔ آپ نیاز ہیں مگر گرامی صاحب کی صحبت ہے تو تمام جہان کے شعراء سے بے نیاز۔

بے نیاز از نہ زار باب کرم می گذرم
چوں سیہ چشم کہ بر سرمہ فروشاں گذرد

باقی خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔
سیالکوٹ جانے کی دو دفعہ کوشش کی، مگر ریزرو گاڑی نہ مل سکی۔ ایک دفعہ ریلوے اسٹیشن سے واپس آنا پڑا کہ حکام نے ریزرو گاڑی دینے کا غیر مشروط وعدہ نہ کیا تھا۔ اتفاق سے اسی شب ملٹری افسر آ گئے۔ مجھے بمع اہل وعیال رات کے ساڑھے بارہ بجے واپس آنا پڑا۔ اس تکلیف کے بعد اب کہیں جانے کی ہمت نہیں رہی۔ گرامی صاحب کی خدمت میں سلام عرض کیجئے۔ ان سے کہیے کہ علم کی ہجو میں کوئی شعر فرمائیے، مگر صوفیانہ رنگ میں نہ ہو یعنی العلم حجاب الاکبر کا رنگ نہ ہو۔

مخلص

محمد اقبال، لاہور

(۲۹)

لاہور، ۴ ستمبر، ۱۹۱۹ء

مخدومی خان صاحب! السلام علیکم

سیالکوٹ نہ جا سکنے کی وجہ عرض کر چکا ہوں۔ اب پھر ارادہ کیا ہے، لیکن امید ہے کہ ارادہ کی تکمیل ہو جائے، اس واسطے کہ اکیلا جاؤں گا۔ اہل وعیال ہمراہ نہ ہوں گے۔ میرے برادر بزرگوار پشاور سے دس روز کی رخصت پر آئے ہیں، اُن سے ملنا ہے۔ ایک ہفتہ یا شاید اس سے بھی (زیادہ) وہاں قیام رہے گا۔ واپس آ کر فیصلہ کروں گا کہ

جالندھر بھی حاضری ہو سکے گی یا نہیں۔ مولینا گرامی کی خدمت میں عرض کیجیے گا کہ پنشن بند کر دانے کا اچھا نسخہ ان لوگوں کو سوجھا۔ انشاء اللہ اب لاہور بلانے کے لئے بھی یہی نسخہ استعمال کیا جائے گا۔ اُن کو معلوم ہوگا، سید علی امام وہاں پہنچ گئے ہیں۔ اگر وہ لاہور نہ آئے تو میں انہیں ضرور لکھوں گا کہ گرامی کی پنشن بند کی جائے اور اس کی عرضیوں کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔

آپ کی غزلوں میں مجھے دوسری غزل (خفت است) کا مطلع پسند ہے۔ باقی اشعار پھر لکھئے۔

کبوتروں کے دو جوڑے جو آپ نے بکمال عنایت عطا فرمائے تھے۔ اُن میں سے ایک جوڑا بچے نہیں دیتا، انڈے توڑ دیتا ہے اور دوسرے کبوتروں کے نیچے بھی اس کے انڈے رکھے جائیں تو بچے نہیں نکلتے۔ دوسرے جوڑے نے بچے دیئے۔ مگر ان میں سے دو جو بہت اچھا اڑتے تھے، شکاری جانوروں کا شکار ہو گئے۔ ایک باقی ہے، جوڑے میں نر ضعیف اور کمزور ہے، امید نہیں دیر تک زندہ رہے، بہتر یہ ہے کہ نئے بچوں کے جوڑے بھجوائیے۔ اگر ممکن ہو تو میں نے لدھیانے بھی لکھا ہے اور شاہجہاں پور سے بھی انشاء اللہ کبوتر آئیں گے۔

آپ کے صاحبزادے نے ذکر کیا تھا کہ فیروز پور میں کوئی شخص ہے جو کبوتروں کو مستقل رنگ دے سکتا ہے، جو رنگ ان کے بچوں میں منتقل ہو سکتا ہے۔ مہربانی کر کے صاحبزادے سے دریافت کیجیے کہ اس آدمی کا پتہ کیا ہے۔ کل کرنل سٹیفنسن صاحب (سے) کبوتروں

کے رنگوں کے متعلق بہت گفتگو ہوئی۔ انہوں نے چند کتابوں کے نام لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ باقی خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔ گرامی صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہو۔

مخلص

محمد اقبال

(۳۰)

مخدومی! السلام علیکم

کارڈ ملا۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ شیخ صاحب سے میں نے آپ کے خط کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ دسمبر کی تعطیلوں سے مراد تھی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح نومبر میں یا اگر ممکن نہ ہوا تو دسمبر (میں) آپ کی خدمت میں ہم دونوں حاضر ہوں گے۔ باقی خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔ مولینا گرامی کی خدمت میں آداب عرض ہوں۔ وہ کب حیدرآباد جانے کا قصد رکھتے ہیں؟ حیدرآباد سے ایک بزرگ نے اپنا دیوان مجھے ارسال کیا ہے۔ اُن کا نام نواب عزیز جنگ (شمس العلما خان بہادر) ہے۔ گرامی صاحب انہیں جانتے ہوں گے۔ والسلام

اُمید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

محمد اقبال، لاہور

۱۴ اکتوبر ۱۹۱۹ء

(۳۱)

عصیانِ ما در رحمتِ پروردگار ما
ایں را نہایتے است نہ آں را نہایتے

مخدومی! السلام علیکم

والا نامہ ابھی ملا ہے۔ اس سے پہلے ایک کارڈ لکھ چکا ہوں۔ شعر مندرجہ عنوان نے بے چین کر دیا۔ سبحان اللہ! گرامی کے اس شعر پر ایک لاکھ دفعہ اللہ اکبر پڑھنا چاہیئے۔ خواجہ حافظ تو ایک طرف، مجھے یقین ہے فارسی لٹریچر میں اس پائے کا شعر کم نکلے گا۔ انسان کی بے نہایتی کا ثبوت دیا ہے، مگر اس انداز سے کہ موحد کی روح فدا ہو جائے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ایک معنی میں انسان بھی بے نہایت ہے اور یہی صداقت مسئلہ وحدالوجود میں ہے۔ شاعر نے اس حقیقت کو اس خوبی سے نمایاں کیا ہے کہ پڑھنے والے پر اسلامی حقائق کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ یہی ہے کمال شاعری جو الہام کے پہلو بہ پہلو ہے۔

"تمہید تبسم خند تو مرگِ ولایتے"

اگر یہ شعر مطلع ہوتا تو خواجہ کی پوری غزل کا جواب ہوتا اور یہ مصرع خواجہ کو سوجھتا تو وہ اس پر فخر کرتے، البتہ پہلے مصرع میں جو لفظ "آں" آیا ہے، اس کو کسی نہ کسی طرح نکالنا چاہیئے (عنوان: آں نگاہ) یہ مشورہ مولینا کی خدمت میں پیش کیجئے۔

زیادہ کیا عرض کروں، اب کہ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ شعر مندرجہ عنوان کے اثر

سے دل سوز و گداز سے معمور ہے۔ گرامی صاحب اپنے شعر کا فوری اثر دیکھتے تو نہ صرف قائل ہو جاتے، بلکہ اپنی ولایت میں بھی انہیں شک نہ رہتا۔ امید کہ اُن کا رُوپیہ حیدرآباد سے آگیا ہوگا۔ لیکن اگر یہ پریشانی اُن سے ایسے اشعار لکھواتی ہے تو اہلِ ذوق کو حضور نظام کی خدمت میں ایک عرضداشت اس مضمون کی بھیجنی چاہیئے کہ اُن کا منصب بند کر دیا جائے۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال، لاہور

۱۴ راکتوبر ۱۹۱۹ء

(۳۲)

لاہور ۱۹ راکتوبر ۱۹۱۹ء

ڈیئر خان صاحب! السلام علیکم

آپ کا خط ملا، الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ گرامی صاحب کے شعر میں "یک" نہایت موزوں ہے "یک نگاہ" اور نیم خندہ کا مقابلہ نہایت لطیف ہے۔ یہ کچھ ضروری نہیں کہ صاحبِ الہام اپنی بلاغت سے بھی آگاہ ہو۔ اگر گرامی صاحب کے خیال میں وہ معانی نہ تھے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اُن کے الفاظ میں تو موجود ہیں۔

مجھے یہ سُن کر تعجب ہوا کہ آپ میرے خطوط محفوظ رکھتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا، جب انہوں نے میرے بعض خطوط ایک کتاب میں

شائع کر دیئے تو مجھے بہت پریشانی ہوئی۔ کیونکہ خطوط ہمیشہ عجلت میں لکھے جاتے ہیں۔ اور اُن کی اشاعت مقصود نہیں ہوتی۔ علیم الفرصتی تحریر میں ایک ایسا انداز پیدا کر دیتی ہے جس کو پرائیویٹ خطوط میں معاف کر سکتے ہیں۔ مگر اشاعت اُن کی نظرثانی کے بغیر نہ ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ میں پرائیویٹ خطوط کے طرزِ بیان میں خصوصیت کے ساتھ لاپرواہ ہوں۔ اُمید ہے، آپ میرے خطوط کو اشاعت کے خیال سے محفوظ نہ رکھتے ہوں گے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص، محمد اقبال، لاہور۔

(۳۳)

لاہور، ۹ نومبر ۱۹۱۹ء

مخدومی! السلام علیکم

نوازش نامہ ملا۔ جس کے لئے شکر گذار ہوں۔

مسئلۂ خلافت ایک خالص مذہبی مسئلہ ہے۔ اس خیال سے کہ اس مسئلے کے متعلق مسلمانوں کو امر بالمعروف کرنا میرا فرض ہے۔ جلسے میں چلا گیا۔ سکریٹری شپ انجمن حمایتِ اسلام کے لئے میں کوئی کوشش نہیں کر رہا۔ مسلمان پبلک میرے سپرد یہ کام کرنا چاہتی ہے اور میں نے بعض معززین سے یہ وعدہ کیا ہے کہ اگر عبدالعزیز صاحب مستعفی ہو جائیں تو میں یہ کام اپنے ذمہ لے لوں گا۔ اس سے زیادہ میری اور کوئی کوشش نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ مقصود جاہ طلبی اور نام و نمود

نہیں۔ اگر عبدالعزیز صاحب نے یہ کام چھوڑ دیا تو میں جہاں تک میرے بس میں ہوگا۔
کام کروں گا۔

آپ کے دوست کے اشعار خوب ہیں، خاص کر یہ مصرع

"اپنی ہستی کے ہم سوالی ہیں"

"ہوا اثر کیا حروفِ خالی ہیں" بھی پتہ کی بات ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں، خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ گرامی صاحب
کی خدمت میں آداب عرض کیجئے۔

۲۳ دسمبر کو دہلی جاؤں گا، وہاں سے ۲۵ یا ۲۶ کو واپس ہوتا ہوا ایک آدھ روز
کے لئے آپ کی خدمت میں ٹھہر جاؤں گا، بشرطیکہ صحت اچھی رہی۔ سردی کا سفر بہ سبب
ضعفِ گردہ میرے لئے مضر ہوتا ہے۔ مولینا اکبر الہ آبادی دہلی میں ہیں اور آخر دسمبر تک
قیام کریں گے۔ اُن کی زیارت ضروری ہے۔ اس کے لئے فقیر سید نجم الدین صاحب کے
لڑکے کی شادی ہے، وہ اصرار کر رہے ہیں۔ اگر مولینا اکبر کی کشش نہ ہوتی تو فقیر صاحب
سے معافی مانگ لیتا والسلام

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

محمد اقبال

(۳۴)

مخدومی! السلام علیکم

کیا دسمبر کی تعطیلوں کے تمام دن آپ جالندھر ہی تشریف رکھیں گے یا کسی اور جگہ جانے کا بھی قصد ہے؟ مطلع فرمائیے۔

گرامی صاحب کی خدمت میں آداب عرض۔

مخلص

محمد اقبال

۱۵ دسمبر، ۱۹۱۹ء

(۳۵)

لاہور، ۱۹ دسمبر، ۱۹۱۹ء

مخدومی! السلام علیکم

تقریر جو اس جلسے میں میں نے کی تھی، وہ ایک ریزولیوشن کی تائید یا شاید تحریک میں تھی، مسئلہ خلافت پر تھی۔ مذہبی پہلو اس (کا) حرمین کی حفاظت سے تعلق رکھتا ہے۔ اخباروں (مثلاً آفتاب) میں اس کا کچھ حصہ رپورٹ ہوا تھا میرے پاس اس کی کوئی کاپی نہیں، ورنہ مرسل خدمت ہوتی۔

۲۳ کی شام کو یہاں سے چلوں گا، مگر فقیر محمد صاحب کے لڑکے کی برات بھٹنڈہ لائن سے جائے گی، اس واسطے جالندھر سٹیشن پر ملاقات نہ ہو سکے گی۔ واپسی پر انشاء اللہ ایک روز آپ کی خدمت میں قیام رہے گا۔ اور مولوی گرامی صاحب سے بھی

ملاقات ہوگی۔ یہ ممکن ہے کہ ۲۵ دسمبر کی صبح کو جالندھر پہنچ جائیں یا شام کو۔ غرض کہ اس سفر میں انشاء اللہ ایفائے وعدہ کی پوری کوشش ہوگی۔ مولیٰنا اکبر تو غالباً ۲۲ سے پہلے ہی الہ آباد چلے جائیں گے، کیونکہ ان کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ میں نے بھی اُن کی زحمت کے خیال سے زور نہیں دیا کہ وہ دہلی میں میری آمد تک قیام فرمائیں۔

۲۵، ۲۶ اور ۲۷ کو آپ جالندھر میں نہ ہوں تو اطلاعی کارڈ لکھ بھیجیں۔ آپ کو سٹیشن پر آنے کی ضرورت نہیں۔ میں سیدھا امیر الدین خاں کی کوٹھی پر پہنچوں گا۔ آپ اُن کو مطلع کر دیں کہ وہ ۲۵ یا ۲۶ کو کسی وقت میرا انتظار کریں۔ مولوی گرامی صاحب سے بھی کہہ دیجئے گا۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال، لاہور۔

(۳۶)

مخدوم مکرم! السلام علیکم

فقہ صاحب کے لڑکے کی برات کے ہمراہ میں نہیں جا سکا۔ اس روز بارش اور سردی اس شدت کی تھی کہ سفر کی جرأت نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ واپسی ٹرین کا رش یقینی۔ انشاء اللہ پھر کبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

مخلص، محمد اقبال

۲۵ دسمبر، ۱۹۱۹ء

(۳۷)

لاہور، ۱۱ فروری ۱۹۳۰ء

مخدومی! السلام علیکم

"مہندرا منڈل" کی کسی کو خوب سوجھی! لیکن تعجب ہے کہ "اندر سبھا" کو نظر انداز کر گئے۔

آپ کے خط سے یہ نہ معلوم ہوا کہ آیا راؤنڈ ٹیبل PRINCES ASSEMBLY سے مراد "پرچیمبر" ہے جو انگلستان کے ہوس آف لارڈز کے طرز پر ہندوستان کے نئے قانون اساسی کا ایک جزو ہوگا یا کوئی اور مجلس۔ نوابوں اور راجوں کی ایک کانفرنس تو شاید پہلے سے بھی قائم ہے۔ غالباً آپ کی مراد پرچیمبر سے ہے۔ انگلستان میں آپ کو معلوم ہے کہ دو ہوس ہیں۔ یعنی ہوس آف کامنز اور ہوس آف لارڈز۔ ہندوستان کے دو ہوسوں کو مجلس عمومی اور مجلس خصوصی کہہ سکتے ہیں۔ یا مجلس عوام اور مجلس خواص۔ بہتر تو یہ ہے کہ انگریزی نام رکھے جائیں، کیونکہ دوغلا نام ایسا مشکل سے نکل سکے گا جو سب کو پسند ہو۔ ایرانیوں نے پارلیمنٹ کا ترجمہ مجلس ہی کیا ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ گرامی صاحب کی خدمت میں سلام عرض کیجئے۔ سنا ہے وہ مجھ پر ناراض ہیں کہ میں نے خلافت کمیٹی سے کیوں استعفا دے دیا۔ وہ لاہور آئیں تو ان کو حالات سے آگاہ کر دوں۔ جس طرح یہ کمیٹی قائم کی گئی اور جو کچھ اس کے بعض ممبروں کا مقصد تھا، اس کے اعتبار سے تو اس کمیٹی کا وجود میری رائے میں مسلمانوں کے لئے خطرناک تھا۔

محمد اقبال

(۳۸)

مخدومی! السلام علیکم   میں ایک طویل سفر کے بعد پرسوں لاہور آیا ہوں۔

ایک مقدمہ کے ضمن میں آرہ (صوبہ بہار) گیا ہوا تھا۔ اب تو کچھ عرصہ تک مزید سفر کی ہمت نہ ہوگی چیمبر

آف پرنسز کے واسطے میرے خیال میں ایوانِ خاص موزوں ہے یا ایوانِ امرا۔ لیکن مقدم الذکر موزوں

تر ہے۔ اگر پہلے چیمبر کو ایوانِ عام کہا جائے۔ ایوانِ اوّل و ثانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر نام یا تو بالکل فارسی

ہونا چاہیے یا بالکل ہندی تینتر گر بر کچھ نہ ہوگا۔ اور کسی کو پسند بھی نہ ہوگا۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

حضور نظامِ گرامی صاحب نے رخصت کی توسیع کرائی ہے۔ والسلام

مخلص، محمد اقبال لاہور

۹ / مارچ ۱۹۲۰ء

(۳۹)

لاہور، ۱۸ / مارچ ۱۹۲۰ء

مخدومی! السلام علیکم

دائرۃ المعارف مصنفہ البستانی مجلد سابع صفحہ ۲۴۴ لم یعقب شخص ؓ من ولد خالد و ابنہ المہاجر

و ابنہ عبد الرحمٰن و حفیدہ خالد ابن المہاجر و غیرہم۔

وقال الزبیر ابن بکار قد انقرض ولد خالد ابن ولید و لم یبق منہم احد۔

مقصود مندرجہ بالا عبارت کا یہ ہے کہ خالد ؓ کی اولاد سے المہاجر عبد الرحمٰن اور خالد ابن

المہاجر ان کے پوتے مشہور ہوئے ہیں۔ الزبیر ابن بکار کہتے ہیں کہ سلسلۂ اولاد خالد ابن ولید کا منقطع ہو گیا۔

آپ کے سوال کا جواب اس میں آجاتا ہے۔ ابن خلکان نہیں دیکھ سکا۔ لیکن سب سے زیادہ معتبر طبقات

ابن سعد ہے مجھے یقین ہے خالد ؓ بن ولید کا ذکر اس میں ضرور ہوگا علی گڑھ کالج کے کتب خانے میں ہے وہاں

کسی کو لکھ کر دریافت کیجیے۔ والسلام

مخلص، محمد اقبال، لاہور

(۴۰)

لاہور، ۱۰ اپریل ۱۹۲۰ء

مخدومی! السلام علیکم

والا نامہ مل گیا ہے، جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔

انجمن کے حالات پر کبھی ملاقات ہوئی تو عرض کروں گا۔ میں خود اس قسم کے جھگڑوں سے علیحدہ رہا اور ہمیشہ سے میرا یہی شیوہ ہے مگر جب عامہ مسلمین مجھ سے کسی خدمت پر اصرار کریں تو انکار نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک میری بساط ہوگی، انشاء اللہ کام کیا جائے گا۔ چندہ کے اعتبار سے اس جلسے کو بڑی کامیابی ہوئی، حالانکہ کام کرنے کے لئے کوئی وقت نہیں ملا۔ الحمد للہ علی ذالک۔

مولینا گرامی آئے ہوئے تھے۔ ان کی طبیعت علیل تھی۔ آج صبح تشریف لے گئے ہیں۔ ہاں کبوتروں کے متعلق لکھنا بھول گیا۔ آپ نے دو جوڑہ ارسال فرمائے تھے، جن میں سے ایک کا عدم وجود برابر تھا۔ کیونکہ وہ اپنے انڈے توڑ دیتا تھا۔ اب مہربانی (کرکے) دو جوڑہ یا اگر دو نہیں تو ایک ارسال فرمائیے۔ وہ نسل کبوتروں کی بہت عمدہ ہے، اس نسل کے ہوں جس سے وہ پہلے کبوتر تھے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مولینا گرامی سٹیشن کی راہ سے ہی واپس آگئے ہیں، کہتے ہیں کہ دو بجے کی گاڑی میں جاؤں گا۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

لاہور ۱۶ر اپریل ۱۹۲۰ء

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے جس کے لئے سپاس گذار ہوں۔ کبوتروں کے واسطے میں نے ماسٹر رحمت اللہ، ڈرائینگ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول، جالندھر کو لکھا ہے۔ اگر وہ عنقریب لاہور آنے والے ہوئے تو اُن کے ہمدست ارسال فرما دیجئے گا اور اگر مجھے معلوم ہوا کہ وہ عنقریب آنے والے نہیں ہیں تو پھر میں آپ کے بلانے پر اپنا آدمی یہاں سے ارسال کر دوں گا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ آپ کے کبوتروں کے برابر میرے تجربے میں کوئی نسل کبوتروں کی نہیں آئی۔ میں نے لدھیانہ، ملتان، سیالکوٹ، گجرات، شاہجہاں پور سے کبوتر منگوائے، مگر اتنی تعداد اچھے خواص کی کسی نسل میں جمع نہیں، جتنی کہ آپ کے کبوتروں میں ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ ظاہری شکل خوبصورت اور اس کے ساتھ اڑان اور کھیل۔

گرامی صاحب یہاں کئی روز رہے اور خوب شعر خوانی ہوتی رہی۔ مگر وہ کچھ بیمار ہو گئے، جس میں اُن کے وہم نے اور اضافہ کر دیا۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کو دکھایا گیا۔ اگر وہ ٹھہرتے تو اُن کا باقاعدہ علاج کرایا جاتا۔ جالندھر اور ہوشیارپور کی نسبت تو اُن کے قدردانوں کی تعداد لاہور میں زیادہ ہے۔ پھر معلوم نہیں وہ کیوں جلد اداس ہو جاتے ہیں۔ کل ان کا خط آیا تھا، جس میں انہوں نے ایک شعر نہایت مزے کا لکھا تھا، اس ضیافتِ روحانی میں آپ کو بھی شریک کرتا ہوں۔

سبق از یک ورق لیلیٰ و مجنوں را چہ حال است ایں
یکے دیوانہ می گردد یکے فرزانہ می خیزد۔

مخلص

محمد اقبال

لاہور، ۱۱ مئی ۱۹۲۰ء

(۴۲)

مخدومی! السلام علیکم

نوازش نامہ ابھی ملا ہے، الحمدللہ کہ آپ کو صحت ہو گئی۔ جس کبوتر کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس کو میں نے بھی خصوصیت سے نوٹ کیا ہے۔ واقعی شکل سے بھی نہایت اچھا اور صاحب اوصاف مطلوبہ معلوم ہوتا ہے۔

نواب ابراہیم علی خاں صاحب نے کنج پورہ سے چند سفید کبوتر بھیجے ہیں۔ دیکھنے میں وہ بھی نہایت اچھے ہیں۔ کیا عجب کہ اوصاف میں بھی اچھے ہوں۔ چونکہ بھیجنے والا بانیٔ کعبہ کا ہمنام ہے۔ اس واسطے میں نے ان کبوتروں کو کبوترانِ حرم کا خطاب دیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل کے کبوترانِ حرم پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کسی فارسی اُستاد کا شعر تھا۔ میں نے اس پر ایک اور شعر لگا کر شریفِ حرم کو خطاب کیا ہے۔

بامرغِ حرم از من دل سوختہ فرما
اے آنکہ بصحرا نفس آزاد بر آری

جویائے گلستانی و از طالع گمراہ

ترسم کہ سرا زخانۂ صیاد برآری"

آپ کا مضمون خلافت میری نظر سے نہیں گذرا، مگر منگوا کر دیکھوں گا۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے بھی اُس کا ذکر کیا تھا۔ ایران کے فلسفے پر میں نے ایک کتاب لکھی تھی، محض ایک خاکہ تھا، جسے بعد میں پُر کرنے کا مقصد تھا۔ مگر وقت نے مساعدت نہ کی۔ افسوس کہ اب اس کی کوئی کاپی میرے پاس موجود نہیں۔ گورنمنٹ کالج کے کتب خانے میں ایک کاپی ہے۔ کئی دن ہوئے، میں نے راما کرشنا، کتب فروش لاہور سے کہا کہ لنڈن سے ایک کاپی مجھے منگوا دے۔ لنڈن سے مل سکتی ہے۔ پتہ یہ ہے:-

MESSRS LUZAC & Co.

ORIENTAL PUBLISHERS & BOOKSELLERS

OPPOSITE TO BRTISH MUSEUM

LONDON.

مخلص

محمد اقبال

(۴/۳)

لاہور، ۱۸ مئی ۱۹۲۰ء

مخدومی! السلام علیکم

نوازش نامہ مل گیا ہے، جس کے لئے ممنون ہوں۔

میں نے نبی کریمؐ کو مخاطب کر کے ایک فارسی قصیدہ لکھنا شروع کیا ہے۔ جس میں یہ سب مضامین انشاءاللہ آجائیں گے۔ خدا کرے کہ یہ ختم ہو جائے۔ مرثی امرتسری نے چند شعر لکھ کر میرے زخم کو چھیڑ دیا۔ اُن کا معمولی جواب تو میں نے زمیندار میں شائع کر دیا تھا۔ جو آپ کی نظر سے گذرا ہوگا۔ اصل جواب ابھی باقی ہے۔ ابھی چند اشعار ہی لکھے ہیں۔ مگر اُن کے لکھتے وقت قلب کی جو حالت ہوئی، اس سے پہلے عمر بھر کبھی نہ ہوئی تھی۔ دو شعر لکھتا ہوں۔

بہر نذر آستانت از عجم آوردہ ام
سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من

تیغ لا در پنجۂ ایں کافر دیرینہ دہ
باز بنگر در جہاں ہنگامۂ الائے من

مخلص
محمد اقبال

(۴۴)

لاہور، ۲۱ مئی ۱۹۲۰ء

مخدومی! السلام علیکم

یہ معلوم کر کے رنج ہوا کہ آپ ابھی تک ناتواں ہیں۔ اللہ تعالیٰ صحتِ عاجل کرامت

فرمائیے۔

جس رشتے کا میں نے ذکر کیا تھا۔ اُس کے کوائف مختصراً یہ ہیں:۔

آپ شاید ــــ[1] کو جانتے ہوں گے۔ یہ صاحب عرصہ سے لاہور میں مقیم ہیں اور ــــ کے رشتے دار اور اصل میں ــــ کے رہنے والے ہیں۔ ــــ کے مکان کے قریب ہی اُن کا مکان ہے۔ یعنی ــــ کے باہر۔

جس لڑکی کا میں نے ذکر کیا تھا، وہ اُن کی نواسی ہے۔ لڑکی کے باپ ــــ کو میں کئی سالوں سے جانتا ہوں۔ نہایت نیک نفس آدمی ہے۔ وہ بھی ــــ کے عزیزوں میں ہیں اور ــــ کے رہنے والے ہیں۔ فنانشیل کمشنر کے دفتر میں بمشاہرہ یک صد یا شاید ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ملازم ہیں۔ اُن کے ہاں اور کوئی اولاد نہیں ہے۔ ــــ کا بھی کوئی وارث سوائے اس لڑکی کی والدہ کے نہیں ہے۔ غرض کہ سارے خاندان میں صرف یہی ایک لڑکی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، لڑکی کی تعلیم و تربیت اچھی ہے اور شکل صورت کے اعتبار سے بھی بہت اچھی ہے۔ والد اُس کا خوش شکل آدمی ہے۔ اس سے بھی یہی قیاس ہوتا ہے ــــ صحیح النسب بھی کہتے ہیں۔ مزید حالات بھی اگر آپ چاہیں تو معلوم ہو سکتے ہیں۔ میں نے یہ خط بہت جلدی میں گھسیٹا ہے۔ اس واسطے کہ روزہ کی وجہ سے طبیعت پریشان ہے اور شام کا وقت قریب ہے۔

---

[1] اصحاب متذکرہ کے نام اور کوائف مصلحتاً حذف کر دیئے گئے ہیں۔

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

(۴۵)

لاہور، ۱۰ جون، ۱۹۲۰ء

مخدومی! السلام علیکم

نوازش نامہ ملا۔ جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔

انسانوں کو خدا نے قبائل میں تقسیم کیا۔ اس واسطے کہ اُن کی شناخت کی جا سکے۔ (وَجعلنٰکم شعوبا وقبائل لتعارفو)، نہ اس واسطے کہ یہ امتیاز سلسلۂ ازدواج میں ممد و معاون ہو۔

خویشتن را ترک و افغاں خواندۂ

وائے بر تو آں چہ بودی ماندۂ

بہر حال میں مزید حالات دریافت کروں گا۔ اُن کے صحیح النسب افغان ہونے میں تو کلام نہیں، مگر ریاستیں وہ شاید سلسلہ پسند نہ کریں۔ اگر امید افزا جواب ملا تو لکھوں گا۔

لندن و برلن کا سفر ضرور کیا تھا۔ مگر وہ بات اور تھی۔

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

اگر وہی امراب بھی محرک ہو تو اقبال افریقہ کے ریگستان طے کرنے کو تیار ہے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھیے کہ جالندھر نہ آئے گا۔ آموں کی کشش، کششِ علم سے کچھ کم نہیں۔ یہ بات بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ کھانے پینے کی چیزوں (میں) صرف آم ہی ایک ایسی شئے ہے جس سے مجھے محبت ہے۔ کل سردار جوگندر سنگھ، ایڈیٹر ایسٹ اینڈ ویسٹ ملنے آئے تھے۔ کہتے تھے لکھنؤ سے بھجواؤں گا۔ اور ساری فصل بھجوا تا رہوں گا۔ چند سال ہوئے مولینا اکبر نے الہ آباد سے لنگڑا آم بھیجا تھا۔ میں نے رسید میں یہ شعر لکھا۔

اثر یہ تیرے اعجازِ مسیحائی کا ہے اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

غرض کہ انشاء اللہ اب کے جالندھر میں آپ سے ملاقات ہونے کی امید ہے۔ جولائی میں عدالت بند ہونے پر مجھے شاید کلکتہ یا الہ آباد جانا ہوگا۔ کیونکہ وہاں ہندوستانی کی یونیورسٹیوں کی کانفرنس ہے اور پنجاب یونیورسٹی نے مجھے اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے۔ اس سفر سے واپس آتے ہوئے انشاء اللہ نیاز الدین خانصاحب کا نیاز حاصل ہوگا۔

افسوس ہے کہ قصیدہ ابھی تک ختم نہ ہوا۔ البتہ کچھ شعر اور ہو گئے ہیں۔ کیا کیا جائے یک سرد ہزار سودا۔ لیکن جو کچھ میرے دل میں ہے وہ کاغذ پر آگیا تو واقعی وہ قصیدہ ایسا ہی ہوگا کہ اسے وظیفہ میں داخل کیا جائے۔ اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ جو پروفیسر نکلسن نے کیا ہے تیار ہو کر پبلشر کے پاس چلا گیا ہے۔ امید ہے، دو چار ماہ میں

شائع ہو جائے گا۔ پروفیسر نکلسن نے یہاں ایک پروفیسر کو خط لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ اس مثنوی کے خیالات MOST ORIGINAL AND REMARKABLE ہیں۔ انگلستان میں انہوں نے کئی لیکچر اس مثنوی پر دیئے ہیں۔ اُن کو یقین ہے کہ ترجمہ مقبول ہو گا۔

زیادہ کیا عرض کروں خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ گرمی کی شدت یہاں بھی ہے۔ اب تک صرف گیارہ روزے رکھ سکا ہوں۔ وسط ایشیا کی ہانڈی اُبل رہی ہے۔ خدا تعالیٰ اپنا فضل کرے۔

تا بروید لالۂ آتش نژاد از خاکِ شام
باز سیرابش ز خونِ ناب مسلماں کردہ اند

کونٹ ٹالسٹائی (روسی امیر جس نے راہبانہ زندگی اختیار کر لی تھی اور جو اس ملک کے بہترین مصنفین میں تھا) کا خیال تھا کہ "لالۂ آتش نژاد" منگولین قوم سے پیدا ہو گا اور اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ اس کا خروج یا ظہور کب ہو گا۔ اور وہ اس وقت روس میں ہے یا وسطِ ایشیا میں یا شام میں۔

مخلص

محمد اقبال

(۴۶)

لاہور، ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۰ء

مخدومی! السلام علیکم

والا نامہ ملا۔ الحمد للہ کہ آپ کا مزاج بخیر ہے۔ شیخ صاحب سے آپ کی خبر ملتی رہی ہے۔

علی گڑھ سے ابھی تک کوئی خبر نہیں آئی۔ اسلامیہ کالج میں بھی وہی حالات پیدا ہو چلے تھے۔ مگر طلبا کو جھپٹی دے دی گئی ہے اور الحاق کے بارے میں خود اُن کی رائے میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے۔ اُمید ہے کہ اب اس بارے میں اراکین انجمن کو تردد نہ رہے گا۔ میری تو یہی رائے ہے کہ گرانٹ اور الحاق کے بارے میں جو فتویٰ علما کا ہو۔ اُس پر عمل کرنا چاہیئے۔ چونکہ واجب الطاعت امام اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس واسطے جمہور مشاہیر علمائے ہند کا فتویٰ ضروری ہوگا۔ صرف ایک عالم کا فتویٰ اس بارے میں کافی نہیں، خواہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ علماء کی غالب جماعت کا اس پر اتفاق ہونا چاہیئے۔ ذاتی رائے میری خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر علماء کا فتویٰ میری ذاتی رائے کے خلاف ہو تو سرِ تسلیم خم ہے۔ جہاں تک میں اندازہ کرتا ہوں، قرآن کے احکام اس بارے میں صاف اور واضح ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ بعض مشہور علما فتویٰ دیتے ہوئے خائف ہیں۔ بعض کی خدمت میں میں نے خطوط لکھے ہیں، مگر اُمید نہیں کہ جواب ملے۔

باقی رہا میرا ان لوگوں سے ہم خیال ہونا، ہم خیال صرف اسی حد تک ہے،

جس حد تک قرآن کا حکم ہو اور بس۔ اخباروں میں انہوں نے شائع کیا ہے کہ اقبال نے قومی آزادیونیورسٹی سے متعلق مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ یوں تو مسلمانوں کے معاملات میں اگر مجھ سے مدد طلب کی جائے تو مجھے تعمیلِ حکم میں کیونکر تامل ہو سکتا ہے۔ تاہم جو کچھ اخباروں میں لکھا گیا ہے، بالکل غلط ہے میرے ساتھ اُن کی کوئی گفتگو اس بارے میں نہیں ہوئی سو واقعات کی رو سے یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس خیال سے کہ علی گڈھ میں اس بیان سے لوگ دھوکہ نہ کھائیں، میں نے ایک تار آنریری سکرٹری کو دیا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے، جو اخباروں میں شائع ہوئی ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

(۴۷)

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔ لیکن اس کا جواب لکھنا کارے دارد۔ بہت طویل ہوگا۔ فرصت مل گئی تو لکھوں گا۔ ورنہ اس وقت کا منتظر رہوں گا جب میں جالندھر آؤں یا آپ لاہور تشریف لادیں۔ انجمن کی سکرٹری شپ سے میں نے استعفیٰ ضرور دیا تھا مگر کام اب تک کر رہا ہوں اور جب تک استعفا منظور نہ ہو، کرتا رہوں گا۔ اُمید ہے کہ عوام کی حالت جنوں اب زیادہ دیر تک نہ رہے گی۔

تعلیم میں عدم تعاون کرنے کا یہ طریقہ نہ تھا، جو بعض لوگوں نے اختیار کیا ہے۔ اگر عدم تعاون کو شرعی فرض بھی تسلیم کر لیا جائے تو طریق کار میرے نزدیک شریعت اسلامیہ کی سپرٹ کے مخالف تھے۔ اس پر مفصل گفتگو زبانی ہوگی اور احکام شریعت جو میری سمجھ میں آئے ہیں، عرض کر دوں گا۔ زمیندار میں آپ نے میرا مضمون ملاحظہ کیا ہوگا۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ کی صحت اب اچھی ہے۔ انشاء اللہ کمزوری بھی رفتہ رفتہ دور ہو جائے گی۔

مخلص

محمد اقبال، لاہور

۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء

(۴۸)

لاہور، ۲۱ر جنوری ۱۹۲۱ء

مخدومی! السلام علیکم

والا نامہ ملا، الحمد للہ کہ اب آپ بالکل بخیریت ہیں اور مارچ میں لاہور آنے کا قصد رکھتے ہیں۔ آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوگی۔ صرف اسرار خودی کا ترجمہ انگریزی میں ہوا ہے۔ انگلستان اور امریکہ کے اخباروں میں عجیب و غریب ریویو اس پر شائع ہو رہے ہیں۔ اس وقت تک تین ریویو میری نظر سے گذرے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ پچاس ریویو شائع ہو چکے ہیں۔ نکلسن (مترجم کتاب) نے جو دیباچہ لکھا ہے۔ وہ پڑھنے

کے قابل ہے۔ یورپ کے پڑھے لکھے آدمیوں میں امید نہیں کہ یہ کتاب مقبول ہو۔ کیونکہ زندگی کے اعتبار سے وہ ممالک خودکشی کی منزل تک پہنچنے کو ہیں۔ نوجوان ملکوں پر اس کا اثر یقینی ہے یا ایسی اقوام پر جن کو خدا تعالیٰ نئی زندگی عطا کرے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی اشاعت ایک اور کتاب کے لئے جو میں لکھ رہا ہوں، زمین تیار کر دے گی۔ اس کا یورپ میں مقبول ہونا بہت ممکن ہے۔ گو ہندوستان میں شاید وہ بھی قبول نہ ہو۔ بہرحال یہ محض قیاسات ہیں۔ قلوب کے حال کا سوائے خدا کے اور کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔

کبوتر اب کے بہت سے شاہین نے ضائع کر دیئے ہیں۔ آپ کے کبوتر سوائے ایک دو کے سب محفوظ ہیں۔ ایک جوڑے نے اتنے عرصہ میں اب کے بچے دیئے ہیں۔ جو اگلے سال اڑنے کے قابل ہوں گے۔

مولوی گرامی صاحب کے خطوط چنداں قابلِ اعتبار نہیں ہوا کرتے۔ وہ جالندھر میں آجائیں تو اُن کے لئے مکان کا انتظام کیجئے۔

صائب کے مطلع کا دوسرا مصرع لاجواب ہے۔ آپ کا شعر بھی خوب رہا۔

والسلام

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

محمد اقبال

(۴۹)

لاہور، ۲۳ اپریل ۱۹۲۱ء

مخدومی! میں نواب ارشاد علی خان صاحب کے مقدمے کے لئے شملہ گیا ہوا تھا۔ وہاں سے دس روز کے بعد واپس آیا تو آپ کا خط ملا۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ ہاں شیخ عبد القادر صاحب جج ہو گئے۔ وسط مئی سے کام شروع کر دیں گے۔

مولانا اکبر کی تنقید میں نے بھی دیکھی ہے۔ ہمدم دیرینہ ہیں۔ اس واسطے مجھے یاد کر لیتے ہیں۔ مولینا گرامی کی کوئی نئی رباعی موصول نہیں ہوئی۔ اسرار خودی کا ترجمہ انگریزی

MESSRS MACMILLAN & CO. PUBLISHERS CALCUTTA

سے ملے گا۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ اُمید کہ جناب کا مزاج بخیر ہو گا۔

والسلام

مخلص

محمد اقبال، لاہور

(۵۰)

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا پوسٹ کارڈ مل گیا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ فتح نامہ تیموری کا مجھے علم نہیں۔ تیموری تزک مشہور ہے جس کی نسبت بعض مورخین کو شک ہے کہ تیمور کی نہیں بلکہ کسی اور کی لکھی ہوئی ہے۔ ابن عرب شاہ نے تیموری تاریخ لکھی ہے۔ جس میں مصنّف

نے خوب دل کھول کر گالیاں دی ہیں۔ تزک تیموری کا اُردو ترجمہ مولوی انشاء اللہ ایڈیٹر وطن نے کیا تھا۔ تزک پڑھنے کا شوق ہو تو تزک بابری بہترین کتاب ہے۔ والسلام

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

محمد اقبال، لاہور

۱۷ جون، ۱۹۲۱ء

(۵۱)

لاہور، ۸ دسمبر، ۱۹۲۱ء

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔

میں اس شعر کا مطلب آپ کو نہ بتاؤں گا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ دوسرا مصرع سمجھتے ہیں۔ جس کو دوسرا مصرع آتا ہے۔ اُسے پہلا بھی آتا ہے۔ اپنی طبیعت کو ٹٹولیے وہاں اس کا مطلب مل جائے گا۔ پوری غزل مخزن کے گذشتہ نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ مجھے اشعار تمام یاد نہیں، انہیں لکھے رکھے ہیں۔ تلاش کی ہمت نہیں۔ مخزن کا وہ نمبر منگوا لیجیے۔

مولوی گرامی صاحب کی خدمت میں آداب عرض کیجیے۔ سردار امراؤ سنگھ شملہ پلا رہے ہیں۔ یہاں سے احباب کی ایک جماعت کرسمس کی تعطیلیں گذارنے

کے لئے شملہ جانے کا قصد کر رہی ہے۔ اگر مولینا گرامی دسمبر میں لاہور آجائیں تو میرے لئے لاہور کی سرد آب و ہوا میں تھوڑی سی حرارت پیدا ہو جائے۔ اُن کی خاطر شملہ کی صحبت ترک کر دوں گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

آپ کے کبوتر بہت اچھے ہیں۔ مگر افسوس کہ زمانۂ حال کی مغربی تہذیب سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ بچوں کی پرورش سے بہت بیزار ہیں۔ والسلام۔ مولینا گرامی کی خدمت میں آداب عرض ہے۔ اُن کو یہ شعر سنائیے۔

دردشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

محمد اقبال

(۵۲)

لاہور، ۱۳ دسمبر ۱۹۳۱ء

مخدومی! السلام علیکم

کل آپ کے چھوٹے بھائی امیر الدین خاں لاہور میں تھے۔ اُن سے آپ کی اور مولوی گرامی صاحب کی خیریت معلوم ہوئی۔ آج آپ کا خط بھی ملا۔ شعر کا مطلب جو آپ نے سمجھا، ٹھیک ہے۔ تختۂ گل کوئی محاورہ نہیں۔ تختۂ گل سے تختۂ گل ہی مراد ہے۔ مقصود یہ ہے کہ جبینِ سجدہ ریز کی وجہ سے دیر کی راہ تختۂ گل بن گئی ہے۔

فارسی والے سجدے کو پھول سے تشبیہ دیتے ہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ مولوی گرامی طال عمرہ کو دعا کہیئے۔

محمد اقبال

(۵۳)

مخدومی! السلام علیکم

پوسٹ کارڈ مل گیا ہے۔ جس کے لئے شکریہ ہے۔

مولینا گرامی کب تک جالندھر کی سیر کریں گے۔ وہاں رہنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ یہاں کے لوگ ان کے مشتاق ہیں اور ہر روز اُن کے متعلق استفسارات رہتے ہیں۔

ہمت مردانہ والی غزل کہیں لکھی رکھی ہے۔ کاغذ مل گیا تو نقل کر کے بھیج دوں گا۔

آپ کی خاطر میں نے بدو رکعت نمازے کا مصرع اوّل بدل دیا۔ اب وہ مصرع یوں ہے:۔

گہے بندۂ بتانم گہے زائر مغانم
کہ نیاز من نگنجد ...... الخ

والسلام

محمد اقبال

لاہور

۱۶ر دسمبر ۱۹۲۱ء

(۵۴)

لاہور ۱۴ جنوری ۱۹۲۲ء

مخدومی! السلام علیکم

آپ کے دونوں خط مل گئے ہیں۔

نبی کریمؐ کی زیارت مبارک ہو۔ اس زمانے میں یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔ دوسری رویا کا بھی مفہوم یہی ہے۔ قرآن کثرت سے پڑھنا چاہیئے۔ تاکہ قلب محمدی نسبت پیدا کرے۔ اس نسبت محمدیہ کی تولید کے لئے یہ ضروری نہیں کہ قرآن کے معانی بھی آتے ہوں۔ خلوص و محبت کے ساتھ محض قرأت کافی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریمؐ زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی اُن کی صحبت سے اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں۔ جس طرح صحابہؓ ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں تو اس قسم کے عقائد کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہوگا۔ اس واسطے خاموش رہتا ہوں۔

اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ مولانا گرامی لاہور میں تشریف رکھتے ہیں۔ کبوتر موجود ہیں، مگر مشکلوں سے بچے پالتے ہیں۔ بڑی دیر کے بعد ایک جوڑے نے بچوں کی پرورش کی ہے۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

(۵۵)

۲۴ر جنوری، ۱۹۲۲ء

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ کہ آپ بخیریت ہیں۔ مولینا گرامی چند روز رہ کر واپس تشریف لے گئے۔ انہوں نے یا اُن کے احباب نے پرانا ہی نسخہ استعمال کیا اور میں نے یہ پیش گوئی بھی کر دی تھی کہ یہ نسخہ استعمال کیا جائے گا۔ بہرحال چند روز اُن کی صحبت میں اچھے گذر گئے۔ "زندگی" سے مراد زندگی بجسد عنصری نہیں۔ حضرت صدیق نے قرآن کی آیت پڑھی تھی۔ قد خلت من قبلہ الرسل اور یہ حق ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ مولوی گرامی صاحب سے مل کر میرا سلام عرض کیجئے۔ اُن کا یہ شعر نہیں بھولتا۔

کتاب عقل ورق در ورق فرو خواندم
تمام حیلہ فروشی و مدعا طلبی است

محمد اقبال، لاہور

(۵۶)

لاہور، ۱۸ر مارچ، ۱۹۲۲ء

مخدومی! السلام علیکم

نوازش نامہ ملا۔ استفسارِ حال کا شکریہ۔

پہلے کی نسبت اب کچھ افاقہ ہے۔ اب کے اچھا ہو لوں تو انشاءاللہ سیر کا ہی کا التزام کروں گا۔ غزل کی نقل کرنے کی ابھی ہمت نہیں۔ آپ لاہور تشریف لائیں گے تو نقل کرا دوں گا۔ امید کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا۔ مولوی گرامی صاحب کی خدمت میں میرا سلام عرض کیجئے۔

والسلام

محمد اقبال، لاہور

(۵۷)

مخدومی! السلام علیکم

میں امتحان کے پرچوں میں مصروف رہا۔ اس واسطے آپ کے خط کا جواب نہ عرض کر سکا۔ ابھی آپ کا خط ملا ہے۔ میں نے سید صفدر علی شاہ صاحب کے ہمدست آپ کے لئے ایک کاپی خضر راہ کی ارسال کی تھی۔ تعجب ہے کہ وہ آپ تک نہیں پہنچی۔ آپ کے فارسی اشعار ماشاءاللہ بہت اچھے ہیں۔

باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ اُمید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ فارسی اشعار کی اصلاح مولوی صاحب سے لیجئے۔

محمد اقبال، لاہور

۱۵ر مئی ۱۹۲۲ء

(۵۸)

مکرم بندہ خان صاحب! السلام علیکم

مجھے نقرس کی بیماری تھی۔ آپ کے دوست کو عرق النساء ہے۔ وہ اور چیز ہے اور اس کا علاج نقرس کے علاج سے بالکل مختلف ہے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

والسلام

محمد اقبال، لاہور

۱۰ جولائی، ۱۹۲۲ء

(۵۹)

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ میں شملہ سے بخیریت واپس آگیا ایک دو روز کے لئے لدھیانہ ٹھہرا تھا۔ مگر افسوس کہ وہاں مجھے نقرس کی پھر شکایت ہوگئی۔ اس واسطے اسی شام لاہور چلا گیا۔ وہاں سے چند گھنٹے کا قیام کر کے سیالکوٹ چلا آیا، کیونکہ میرے بھائی صاحب کی علالت کی خبر آئی تھی۔ دوا کے متواتر استعمال سے نقرس کی شکایت رفع ہوگئی ہے۔ جالندھر میں مولوی گرامی صاحب کی خدمت میں ٹھہرنے کا قصد تھا۔ مگر نقرس کی شکایت نے مجھے رستے میں ٹھہرنے نہ دیا۔ اندیشہ تھا کہ اگر شکایت زیادہ ہو گئی تو مولوی صاحب کے لئے باعثِ زحمت بن جاؤں گا۔ اب ان کی ملاقات کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ انشاء اللہ یہاں سیالکوٹ میں قریباً ایک ہفتہ قیام رہے گا۔ ستمبر میں ممکن ہے، پھر حملہ جاؤں۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

مولوی گرامی صاحب کی خدمت میں آداب عرض ہو۔ آپ کی

رباعی اچھی ہے۔

محمد اقبال، لاہور

۱۷ اگست، ۱۹۲۲ء

(۶۰)

لاہور، ۱۶ دسمبر، ۱۹۲۲ء

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔ جس کے لئے شکر گذار ہوں۔ افسوس ہے میں علی گڈھ نہ جا سکوں گا۔ سردی کا موسم (ہے) اور مجھے اس موسم میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ علی گڈھ کانفرنس ایک مدت سے مر چکی ہے۔ حبیب الرحمٰن خاں شروانی اسے زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر

پئے نافہ ہائے رمیدہ بو، مپسند زحمت جستجو
بخیال حلقۂ زلف او، گرہے خورد بخستن در آ

محمد اقبال

(۶۱)

لاہور، ۱۹ دسمبر، ۱۹۲۲ء

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے۔

مالیر کوٹلے کی جج کے متعلق یہ عرض ہے کہ آپ ایک باقاعدہ عرضی لکھیں نواب مالیر کوٹلہ سے مجھے بھی واقفیت ہے۔ میں اس پر سفارش لکھوں گا اور نواب صاحب سے بھی لکھوا دوں گا۔ اس کے علاوہ میر عبداللہ شاہ صاحب، نواب صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری بھی میرے دوست اور ہم جماعت ہیں۔ اُن کی خدمت میں بھی خط لکھ دوں گا۔ عرضی لکھ کر آپ لاہور لے آئیں۔ ذوالفقار علی خان صاحب سے نواب مالیر کوٹلہ کے مراسم بہت اعلیٰ درجہ کے نہیں ہیں۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی عرضی پر سفارش لکھنے سے دریغ نہ کریں گے اور اگر سفارش کے علاوہ پرائیویٹ خط بھی انہوں نے لکھ دیا تو زیں چہ بہتر۔ تصویر آپ کی خدمت میں مرسل ہے۔ مگر اس میں تامل ہے کہ اُسے کسی نمایاں جگہ پر لٹکایا جائے۔ میں بڑے بڑے مجمعوں میں محض اس لئے نہیں جایا کرتا کہ لوگ دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں وہ اقبال آیا۔ مجھے اس قسم کی شہرت سے بہت الجھن ہوتی ہے۔ باقی خیریت ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

(۶۲)

مکرمی جناب خانصاحب! السلام علیکم

آپ کا خط صبح مل گیا تھا۔ الحمدللہ کہ جناب کا مزاج بخیر و عافیت ہے۔ میں بھی خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ کل شام ہوائے سرد کی وجہ سے دردِ گردہ کا آغاز تھا۔ مگر میں نے

فوراً تدابیر اختیار کر لیں اور خدا کے فضل و کرم سے تندرست رہا۔ رموزِ بیخودی کے ترجمے کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں، مگر امید نہیں کہ اس کا ترجمہ یورپ میں ہو کہ اس کے مضمون سے یورپ والوں کو چنداں دلچسپی نہیں ہے۔ مسلمان ہی اس کا مفہوم سمجھ جائیں تو غنیمت ہے۔ البتہ پیامِ مشرق کا ترجمہ ہونا ممکن ہے۔ لیکن مجھے اس قدر فرصت نہیں کہ اس کا ترجمہ کر دوں۔ اگر اُن کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو خود کر لیں گے۔ آپ کے اشعار خوب ہیں۔ مولوی گرامی صاحب کی خدمت میں خط لکھا تھا۔ ۲۰ مارچ تک لاہور آنے کا وعدہ بھی کرتے ہیں، مگر امید نہیں کہ آئیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔

خادم

محمد اقبال، لاہور

۱۲ مارچ، ۱۹۲۳ء

(۶۳)

لاہور، ۲۵ مئی، ۱۹۲۳ء

ڈیئر خان صاحب! السلام علیکم

آپ کا خط پہنچ گیا تھا۔ میں علیل تھا اور اب تک ہوں۔ اس واسطے جواب عرض نہ کر سکا۔ شیخ مبارک علی صاحب مجھ سے نہیں ملے، وہ یہاں سے بہت دور ہیں۔ اگر وہ آ گئے تو میں اُن سے کہہ دوں گا کہ آپ کی خدمت میں کتاب ارسال کر دیں۔ کتاب کو شائع ہوئے دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے۔ اور شاید نصف کے قریب

نکل بھی گئی ہے۔ ایک ہزار کاپی شائع ہوئی تھی۔ آپ کا مضمون میں نے اخبار میں دیکھا۔ آپ کی تجویز خوب ہے۔ مگر ابھی اس ملک کے لوگ اس امور کی شناخت نہیں رکھتے۔ مجھ سے بعض لوگ کہہ رہے ہیں کہ لاہور کی نیابت کونسل میں کرو لیکن اور امیدوار بھی ہیں اور میں یہ بات خلافِ انصاف تصور کرتا ہوں کہ ان سے کہوں کہ تم میری خاطر امیدواری سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ وعدۂ امداد کے لئے شکر گزار ہوں۔ مگر غالباً میں کھڑا نہ ہوں گا۔ ہاں اگر لاہور کے لوگوں نے مجبور کیا تو یہ بوجھ سر پر اٹھانا ہوگا۔ گرامی صاحب کا ایک عرصہ سے کوئی خط نہیں آیا۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ میرا مسوڑا پھول گیا تھا، آپریشن کرایا گیا جس سے تکلیف میں اضافہ ہوا۔ اب کچھ آرام ہے۔ والسلام

محمد اقبال

(۴۶)

لاہور، ۲۵ جون ۱۹۲۳ء

مخدومی خان صاحب! السلام علیکم

والا نامہ ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔

آپ کے مضمون کا دوسرا حصہ مسلم آؤٹ لک میں شائع ہو گیا ہے۔ آپ کے ملاحظہ سے گزرا ہوگا۔ مرزا جلال الدین صاحب نے بھی اس کے متعلق کچھ لکھا ہے جو میں نے نہیں دیکھا۔ وہ ذکر کرتے تھے کہ مسلم آؤٹ لک میں شائع ہوگا۔

آپ کے دوست ضرور آپ کے ہم خیال ہوں گے۔ مگر اقبال نمبر قائم کرنا میری رائے میں جس میں میرے ضمیر کی آواز بھی شامل ہے، درست نہیں۔ مسلمان غریب قوم ہیں اور باوجود اس غریبی کے گذشتہ دس بارہ سال میں ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ چندوں میں دے چکے ہیں۔

میں خود تو یہاں تک احتیاط کرتا ہوں کہ جو لوگ کتاب کو پڑھ نہیں سکتے، وہ اسے خرید بھی نہ کریں، کیوں کہ ان کو اس کی خریداری کی ترغیب دینا ایک قسم کی ناانصافی ہے۔ باقی رہا میں، سو میری طرح امتِ مرحومہ میں سینکڑوں آدمی آگے گذر گئے ہیں۔ جنہوں نے رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے کام کیا ہے۔ مجھ سے بھی جہاں تک ہو سکے گا، انہیں کی تقلید کروں گا۔ شاید آپ نے کسی گذشتہ خط میں مجھ سے کونسل کی امیدواری کے متعلق دریافت کیا تھا۔ سو عرض ہے کہ لاہور کے مسلمانوں نے مجھ سے بہت کہا مگر میں نے انکار کر دیا۔ لیکن اب تک ان کا اصرار بدستور جاری ہے۔ قریباً ہر روز ان کا ایک نہ ایک وفد آ جاتا ہے۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

(۶۵)

۲۰ جولائی ۱۹۲۳ء

ڈیر خان صاحب! السلام علیکم

آپ کا خط صبح آیا تھا۔ کچہری سے واپس آکر اسے پڑھا۔ غالباً میں الیکشن کے ہنگامے میں نہ پڑوں گا۔ لاہور کے لوگ مجبور کرتے ہیں اور بہت سے ڈیپوٹیشن اُن کے آچکے ہیں۔ مگر میاں عبدالعزیز سے مقابلہ کرنا میں نہیں چاہتا۔ اُن سے دیرینہ تعلقات ہیں۔ اگرچہ مقابلہ کے بعد انتخاب ہو جانا قریباً یقینی ہے۔ تاہم یہ بات میرے نزدیک مروت کے خلاف ہے کہ ایک موہوم دنیوی فائدے کی خاطر تعلقات کو نظر انداز کر دوں۔

پیامِ مشرق کے متعلق بہت سے خطوط دُور و نزدیک سے آئے ہیں اور آ رہے ہیں۔ برلن سے ایک پروفیسر نے لکھا ہے کہ "حیرت انگیز" کتاب ہے۔ پروفیسر ہارووٹیز، جو علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر تھے اور اب جرمنی میں اس پر ریویو لکھ رہے ہیں جو جرمن اخبارات میں شائع ہو گا۔ پروفیسر نکلسن نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک قابلِ تحسین جواب گوئٹے کے دیوانِ مغربی کا ہے اور جدید اور اوریجنل خیالات و افکار سے لبریز ہے۔

میں یہ سُن کر خوش ہوا کہ اس کے اثر سے آپ پر اشعار نازل ہوتے ہیں۔ مثنوی کے تیسرے حصے کے لیے دل و دماغ تیار ہو رہے ہیں۔ تکمیل اس کام کی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ کیا عجب کہ اپنے حبیبِ پاک کے صدقے میں ان مضامین کو معرضِ شہود میں لانے کی توفیق عطا فرمائے۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

مثنوی کے تیسرے حصّے میں مسلمانوں کے آئندہ سو سال کے افکار و اعمال کے لئے مواد ہوگا۔

مخلص

محمد اقبال

(۶۶)

مکرم بندہ جناب خان صاحب! السلام علیکم

میں نے جو کچھ آپ کو خط میں لکھا تھا وہ پرائیویٹ خطوط کا اقتباس تھا۔ یورپین لوگوں کے نزدیک پرائیویٹ خطوط یا اُن کا اقتباس بغیر اُن کی اجازت کے چھاپنا ٹھیک نہیں۔ اس کے علاوہ اُس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ فرینک فورٹ کے پروفیسر مارو وائیٹرز کا ریویو عنقریب ہندوستان آئے گا۔ وہ غالباً خود ہی اس ریویو کی ایک کاپی میرے ملاحظہ کے لئے ارسال کریں گے۔ اس کا انگریزی ترجمہ کرا کے یہاں شائع کر دیا جائے گا۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

محمد اقبال، لاہور

۲۸ جولائی ۱۹۲۳ء

۲۸ کا مسلم آؤٹ لک ملاحظہ کیجئے۔

لاہور میں موسم اچھا رہا۔ آج قدرے گرمی ہے۔ میں کل سیالکوٹ جا رہا ہوں۔

وہاں سے واپس آ کر اگر ممکن ہوا تو شملہ جاؤں گا۔

محمد اقبال

(۶۷)

ڈیئر خان صاحب! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ میں سیالکوٹ سے آرہا ہوں۔ اب ایک دو روز میں شملہ جا رہا ہوں۔ جواب لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو پہلے ہی اس تحریک کا مخالف تھا۔ اُن خطوط سے جو مسلم آؤٹ لک میں شائع ہوئے ہیں۔ مجھے اچھی طرح سے معلوم ہو گیا ہے کہ ہمارے ملک کے لوگ حقیقتِ حال سے آگاہ نہیں۔

نا اُمید استم ز یارانِ قدیم طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

والسلام

محمد اقبال، لاہور

۲ اگست، ۱۹۲۳ء

اُمید کہ آپ کا بخار اُتر گیا ہوگا۔

محمد اقبال

(۶۸)

مخدومی جناب خانصاحب! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے، جس کے لئے شکریہ قبول فرمائیے۔ افسوس ہے کہ امسال کہیں نہیں جا سکا۔ اگست کے شروع میں میری بیوی کو ٹائی فائڈ فیور ہو گیا۔ جس کی وجہ سے وہ شروع ستمبر تک بیمار رہیں۔ اگرچہ اب بخار نہیں۔ تاہم صحت ابھی تک درست نہیں ہوئی۔ نواب صاحب کا خط میں نے بھی دیکھا تھا۔ آپ کا خط بھی اُمید ہے نظر سے گذرے گا۔ پیام مشرق کی دوسری ایڈیشن تیار ہو رہی ہے۔ اس میں بہت سا اضافہ ہو جائے گا۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال، لاہور

۱۰ ستمبر، ۱۹۲۳ء

(۶۹)

مکرمی! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ میں خدا کے فضل و کرم سے بخیر ہوں۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

نواب صاحب سے آپ کی تحریروں کے متعلق میرا کوئی ذکر نہیں آیا۔ لوگوں کو ان باتوں کے متعلق سوچنے کی فرصت نہیں اور نہ وہ اس کام کو فی الحال سمجھ سکتے ہیں، میں نے جو کیا ہے، اس واسطے ان کو معذور سمجھ کر میں خاموش ہوں اور کسی ایسی تحریک میں کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں رکھتا۔ امید کہ آپ کنج پورہ میں کوئی مفید کام

کر سکیں گے۔ نواب کنج پورہ نہایت نیک نفس آدمی ہیں۔ اُن سے آپ کا نباہ بھی خوب ہوگا۔

مخلص

محمد اقبال، لاہور

۲۰ جنوری، ۱۹۲۴ء

(۷۰)

مخدومی! السلام علیکم

والا نامہ ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ کہ آپ مع الخیر کنج پورہ پہنچ کر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ علی گڑھ جانے کا قصد تو تھا مگر سردی اور متواتر بارش کی وجہ سے کمر میں درد ہونے لگی۔ یورک ایسڈ کے دور کرنے کی دوائی پی رہا ہوں۔ اس اندیشہ سے کہ گوٹ کا حملہ نہ ہو جائے۔

پیام مشرق چھپ رہا ہے۔ مجموعہ اُردو مرتب ہو چکا ہے۔ دو تین روز تک کاتب کے ہاتھ میں ہو۔ علما کے اسما اچھی طرح پڑھے نہیں گئے۔ اگر یہ فلسفیوں کے نام ہیں تو ان میں سے اکثر غیر معروف ہیں۔ میں صرف چند نام پڑھ سکا ہوں۔

مشہور سائی کالوجسٹ ہے مگر اب اس کو شاید BAIN (۱) کوئی نہیں پڑھتا۔

(۲) BUCHNER بخنر نمبر ۲ بھی فلسفے میں یکتا ہے، مگر بہت
مشہور اساتذہ میں نہیں سمجھا گیا۔

(۳) GIEGER نمبر ۳ مستشرق ہے جس نے زیادہ تر ایرانی
تہذیب و زبان پر لکھا ہے۔ ممکن ہے کوئی اور شخص ہو۔

(۴) PHYSIOLOGY علم اعضائے انسانی

والسلام

مخلص

محمد اقبال

۱۱ر فروری، ۱۹۲۴ء

آپ کا مصرع بہت اچھا ہے۔ محمد اقبال

(۱۷)

لدھیانہ، ۲۲ر اپریل، ۱۹۲۴ء

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مل گیا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ لاہور میں طاعون کا زور ہے۔ میں چند دنوں سے مع اہل و عیال لدھیانے میں مقیم ہوں۔ دو چار روز میں واپس لاہور جاؤں گا۔

قلندر صاحب بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ اُن کے عرس پر روپیہ

صرف کرنا اور مسکینوں کو کھانا کھلانا بڑی برکت کا باعث ہے۔ امید کہ آپ کو اپنے نئے ماحول میں کبھی کبھی پرائیویٹ مشاغل کے لئے فرصت مل جاتی ہو گی۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

(۷۲)

لاہور، ۱۳ جولائی، ۱۹۲۴ء

ڈیئر خان صاحب! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ میں کئی روز تک بیمار رہا۔ مسوڑا پھول گیا تھا جس کو کل چرواد یا گیا۔ اب خدا کے فضل سے آرام ہے۔ مگر گذشتہ ہفتہ سخت تکلیف رہی۔

اُردو مجموعہ چھپ گیا ہے۔ قریباً دو ہفتہ تک بالکل تیار ہو جائے گا۔ شیخ عبدالقادر صاحب اس کا دیباچہ لکھ رہے ہیں۔ جو کل انشاء اللہ ختم ہو جائے گا۔ اس کی لکھائی چھپائی میں ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ میں بھی اگست میں شملہ جانے کا قصد کر رہا ہوں۔

آج کل گرمی سخت ہے۔ بارش مطلق نہیں ہوئی۔ فکر سخن کے لئے یہ موسم نہایت خراب ہے۔ تاہم کبھی کبھی شبنم کی کوئی نہ کوئی بوند برس جاتی ہے۔ ایک

چھوٹی سی کتاب لکھ رہا ہوں، جس کا نام غالباً یہ ہو گا:۔

SONGS OF A MODERN DAVID

نواب صاحب قبلہ کی خدمت میں آداب عرض کیجئے۔ اُمید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

مخلص،

محمد اقبال

(۷۳)

لاہور، ۲۹ نومبر، ۱۹۲۴ء

جناب خانصاحب! السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ نواب صاحب کے صفاتِ ستودہ کا میں مدت سے قائل ہوں۔ خاص کر اُن کی دینداری اور اسلامیت کا اُن کے کام کے لئے میں دل و جان سے حاضر ہوں اور اپنی بساط کے مطابق اُن کے حقوق کے حصول کے لئے انشاءاللہ پوری کوشش عمل میں لاؤں گا۔ میری طرف سے اُن کی خدمت میں عرض کر دیں کہ میری خدمات اُن کے لئے حاضر ہیں۔ میں خود ہی گورنر صاحب کی خدمت میں اُن کا میموریل پیش کر دوں گا۔ (اگر اُن کی ایسی خواہش ہو) موجودہ گورنر کو میں جانتا بھی ہوں اور اس کے علاوہ میرے پرانے دوست اور استاد مسٹر آرنلڈ کے وہ نہایت گہرے دوست ہیں۔ غرض کہ میں

ہر طرح سے حاضر ہوں۔ باقی رہا فیس کا معاملہ، سو اس کے متعلق فکر کرنے کی ایسی ضرورت نہیں۔ اول تو مجھے اس وقت معلوم نہیں کہ کام کی نوعیت اور مقدار کیا ہے۔ دوئم اگر یہ امور معلوم بھی ہوں تو خدانخواستہ یہاں دوکانداری نہیں، خلوص اور خدمت ہے۔ نواب صاحب خود بفضلہ نکتہ رس ہیں اور آپ بھی تجربہ کار آدمی ہیں۔ معاملات کی اہمیت کا اندازہ کرنا جانتے ہیں۔ مجھے اس معاملے میں عرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سوائے اس کے کہ آپ کے خیال میں جو کچھ فیس اس خدمت کے لئے ماڈریٹ ہوگی، وہی میرے خیال میں بھی ماڈریٹ ہوگی۔ آپ اگر لاہور تشریف لائیں تو مجھے کام کی مقدار اور نوعیت سے آگاہ فرمائیں۔ میں مع سر ذوالفقار علی خان آج شام کرنال جا رہا ہوں۔ دو ایک روز وہاں قیام رہے گا۔ ممکن ہے آپ سے یا نواب صاحب سے ملاقات ہو جائے۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

(۷۴)

لاہور، ۲۳ دسمبر ۱۹۲۴ء

مخدومی جناب خان صاحب! السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مل گیا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک خط ملا تھا۔ مگر افسوس کہ میں بوجہ مشاغل خط نہ لکھ سکا۔ نواب صاحب کی خدمت میں عرض

کر دیجیے کہ میں میموریل لکھنے کے (لئے) حاضر ہوں۔ مگر آپ مہربانی کر کے تمام کاغذات متعلقہ لاہور لے آویں تاکہ کام کی کیفیت و کمیت کا اندازہ کر سکوں۔

اس کے علاوہ ان کو پڑھ کر اور سمجھ کر یہ رائے بھی لگا سکوں کہ آیا اس میں کامیابی کی توقع ہے یا نہیں۔ کیونکہ میرا فرض ہے کہ اس بارے میں بھی نواب صاحب کو پیشتر لکھنے کے رائے دے سکوں۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ نواب صاحب قبلہ کی خدمت میں میری طرف سے آداب عرض کیجیے۔ میں تعطیلوں میں لاہور ہی میں رہوں گا۔

والسلام

مخلص

محمد اقبال، لاہور

(۷۵)

لاہور، ۲۰ جنوری، ۱۹۲۵ء

مکرمی جناب خان صاحب! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔

میموریل کے لئے ضروری (ہے) کہ تمام سامان مہیا ہو، ورنہ میموریل لکھنا فضول ہے۔ آپ کو نظام کا معاملہ برار جو ابھی تازہ ہے، یاد ہوگا۔ اتنے سامان کے ہوتے ہوئے بھی ٹکا سا جواب ملا۔ گو ہمارے نواب صاحب کے

معاملہ کو برار کے معاملہ سے چنداں مناسبت نہیں، تاہم پوری تیاری کرنی ہوگی۔ یہ وقت زیادہ تر اس وجہ سے ہے کہ اور ریاستیں بھی جن کے اختیارات چھین لئے گئے تھے، اس معاملے سے تعلق رکھتی ہیں۔ امرائے ہند کے متعلق اس وقت خیالات بھی اچھے نہیں ہیں۔ غرضکہ موجودہ حالات میں پوری تیاری کرنی چاہیئے۔ اور اگر کامیابی کی امید موجودہ مسالہ سے نہ ہو تو انکار کرنا بہتر ہوگا۔

پیرزادہ صاحب کی مثنوی کا حال مجھے معلوم ہے۔ مسلمانانِ ہند کے دل و دماغ پر عجمی تصوّف غالب ہے۔ وہ عربیت کے تخیلات کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ میں تو ایک معمولی آدمی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر نبی کریمؐ بھی دوبارہ پیدا ہو کر اس ملک میں اسلام کی تعلیم دیں تو غالباً اس ملک کے لوگ اپنی موجودہ کیفیات اور اثرات کے ہوتے ہوئے حقائق اسلامیہ کو نہ سمجھ سکیں۔

اسلام نہایت سادہ مذہب ہے۔ لیکن اس کی بدیہیات کے اندر ایسی ایسی مشکلات ہیں جن کی حقیقت کا سمجھنا آسان کام نہیں۔ خاص کر اُن لوگوں کے لیے جن کو عجمی "بلند خیالی" کے افسوں نے محسوس فراموش کر دیا ہے زیادہ کیا عرض کروں۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

جناب نواب صاحب بہادر کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

مخلص

محمد اقبال

(۷۶)

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ آپ بہمہ وجوہ مع الخیر ہیں۔ میں بھی خدا کے فضل وکرم سے بالکل تندرست ہوں۔ تعطیل لاہور ہی میں بسر کی۔

نواب صاحب کو بہ نسبت سابقہ آرام ہے۔ مگر ابھی پورے طور پہ صحت بحال نہیں ہوئی۔ بہت کمزوری ہے۔ یکم اکتوبر کو شملہ سے دہلی جائیں گے اور وہیں قیام کریں گے۔ باقی خیریت ہے۔ والسلام

مولینا گرامی صاحب کی خدمت میں آداب۔

مخلص

محمد اقبال

۲۹ ستمبر ۱۹۲۵ء

(۷۷)

ڈیئر خان صاحب! السلام علیکم

حال کے فارسی شعراء کی کتب مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں اور قیمتیں بہت گراں۔ بھنڈی بازار بمبئی میں ملک التجار ایرانی کی مشہور دوکان ہے۔ وہاں شاید دستیاب ہو جائیں۔

ملک الشعرا بہار قزوینی یا مشہدی کا دیوان چھپ گیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے حال میں ایک اور مجموعہ "اردی بہشت" کا نام دیکھا ہے۔ یہ گورنمنٹ کالج کی لائبریری میں موجود ہے۔ پروفیسر براؤن کی کتاب PRESS AND POETRY OF PERSIA میں بھی بہت سے نمونے شعرا ردان کے کلام کے موجود ہیں۔ مگر زمانہ حال کے ایران کی نثر پڑھنے کے قابل ہے۔ نظم میں کچھ نہیں۔ زیادہ تر پولیٹکل مضامین پر وہ لوگ لکھتے ہیں۔ والسلام

محمد اقبال

۸ر مارچ، ۱۹۲۷ء

(۷۸)

ڈیئر خان صاحب! السلام علیکم

پنجاب مسلم لیگ کی طرف سے میمورنڈا سائمن کمیشن کو بھیجا جائے گا، جس میں مفصل حالات اور مسلمانوں کے مطالبات درج ہوں گے۔ انگلستان میں پروپیگنڈا کا وقت اس سال نہیں، آئندہ سال آئے گا۔ افسوس کہ مسلمان پورے طور پر بیدار نہیں اور یوں بھی مفلس ہیں۔ "اُمرا" اور خیالات میں غرق ہیں۔ علمائے مذہبی جھگڑوں میں مصروف ہیں۔ بعض خود غرض لوگ محض اپنی گرم بازاری کے لئے مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرتے رہتے ہیں۔ والسلام

محمد اقبال، لاہور

۳۰ر مارچ ۱۹۲۸ء

(۷۹)

مخدومی! السلام علیکم

والا نامہ مل گیا ہے۔ مجھے دردِ گردہ کی شکایت رہی جس کا سلسلہ ایک ماہ سے اوپر جاری رہا۔ جدید طبی آلات کے ذریعہ گردہ کا معائنہ کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ گردہ میں پتھر ہے اور عملِ جراحی کے بغیر چارہ کار نہیں ہے، مگر تمام اطبا٘ء اور دوست عمل جراحی آمرے کے خلاف ہیں۔ درد فی الحال رُک گیا ہے اور میں حکیم نابینا صاحب سے علاج کرانے کی خاطر آج شام دہلی جا رہا ہوں۔ وہاں چند روز قیام رہے گا۔ اس کے بعد تبدیلی آب و ہوا کے لئے چند روز کے لئے شملہ میں قیام کروں گا۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ اس طویل علالت نے مجھے کمزور کر دیا ہے۔ البتہ درد کا افاقہ ہے۔ سو خدا تعالیٰ کا شکر ہے۔ والسلام

آپ کی ہمدردی کا تہِ دل سے مشکور ہوں۔

مخلص

محمد اقبال، لاہور

۱۵ر جون، ۱۹۲۸ء

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے حضور میں

سیدہ شان معراج

تارین ٹکلی۔ مقابل موہن نرسنگ ہوم شاہجہان پور (اتر پردیش)

چراغِ جادۂ احساس ہے درسِ خودی تیرا   حقیقت ہی حقیقت ہے پیامِ شاعری تیرا
کمالِ فن ترے قدموں پہ اپنا سر جھکاتا ہے   یہ شانِ خسروی تیری یہ حسنِ آگہی تیرا
پسندِ خاطرِ اہلِ بصیرت ہے زمانے میں   نگاہِ بے ریا تیری وقارِ بندگی تیرا
بڑی ندرت بڑی رفعت بڑی شوکت بڑی عظمت   سخن ہے واقعی جزویست از پیغمبری تیرا
گدازِ فکر و سوزِ دل وہاں جوہر دکھاتا ہے   جھلکتا ہے جہاں بھی جذبۂ عشقِ نبی تیرا
رہِ شعر و ادب کو جگمگائے گا قیامت تک   طریقِ رہروی تیرا شعورِ رہبری تیرا
عمل پیہم محبت فاتحِ عالم ترا مسلک   متاعِ حریت رنگِ مذاقِ زندگی تیرا
تعین کس طرح تیری بلندی کا کیا جائے   کہ دنیا میں نہیں پیدا ہوا ناقد ابھی تیرا
فرنگی ہوں کہ رومی ہوں وہ افغانی کہ تاتاری   ادب کرتے ہیں دل سے شاعرِ مشرق سبھی تیرا

منور شان کا دل کیوں نہ ہو حسنِ عقیدت سے
کہ ہے ذوقِ سخن پہ اس کے احسان واقعی تیرا

ترتیب

مردِ حق آگاہ	غلام مرتضےٰ ساچہ	۵
شاعرِ مشرق	میاں اصغر علی	۱۱
قرارداد	ڈاکٹر بشیر احمد خاں	۱۶
تقدیرِ اُمم	ڈاکٹر محمد باقر	۱۷
اقبال ایک مصلح	مس اے عبدالرحمٰن	۳۵
اقبال کا مسلمانوں سے خطاب	علی حضر نجفی	۴۷
ادبیاتِ معاصرِ ایران پر اقبال کا اثر	ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی	۵۹
علامہ اقبال اور مطالعۂ تاریخ	ڈاکٹر وحید قریشی	۷۹
اقبال کے عمرانی تصوّرات	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	۸۹

پیامِ مشرق پر ایک نظر	ڈاکٹر سید محمد اکرم	۱۰۱
اقبال کا فلسفۂ تعلیم	پروفیسر کرم حیدری	۱۱۹
خطبۂ اختتامیہ	مولانا بشیر احمد اخگر	۱۴۷
محفلِ مشاعرہ	اسلم ملک	۱۵۵
حرفِ مرتب	"	۱۶۷
اقبال کا مولد	"	۱۹۱
اقبال اور مسجدِ قرطبہ (ایک جائزہ)	سید اختر الاسلام	۲۰۱
مکاتیبِ اقبال (بنام خان محمد نیاز الدین خان مرحوم)		۲۲۳
علامہ اقبال کے حضور میں	سیدہ شان معراج	۳۱۰